علامہ اقبال

(صوفی تبسم کی نظر میں)

نثار احمد فریدی

علاّمہ اقبال

(صُوفی تبسّم کی نظر میں)

مرتبہ

نثار احمد قریشی

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے

اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ — لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : پروفیسر محمد منور
ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶- میکلوڈ روڈ ، لاہور

طابع : میاں محمد یعقوب

مطبع : حمایت اسلام پریس ، ریلوے روڈ ، لاہور

نگران طباعت : فرخ دانیال

طبع اول : ۱۹۸۳ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : ۳۰ روپے

انتساب

اپنے والدین کی شفقت آمیز نگاہوں اور پُرخلوص دعاؤں کے نام

١٩٣٠
١٢٠ — ٨:١

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ
	عرضِ مرتب	الف
١-	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۔ سوانح اور تصانیف	١
٢-	علامہ اقبال اور صوفی تبسم ۔ عقیدتیں اور تعلقات	٧
٣-	علامہ اقبال کی شاعری	٢٣
٤-	نظم مسجدِ قرطبہ	٥٧
٥-	اقبال کا ساقی نامہ	٦٧
٦-	اردو ادب میں اقبال کی شاعری کا حصہ	٧٧
٧-	اقبال کی ایک نظم ، والدہ مرحومہ کی یاد میں	٨٩
٨-	اقبال اور تغزل	٩٩
٩-	اقبال کے کلام میں موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی	١٠٩
١٠-	عورت ، اقبال کی نظر میں	١٢٣
١١-	سرودِ انجم	١٣١
١٢-	اردو شاعری میں قومی تحریک اور اقبال	١٤٧
١٣-	اقبال اور تصوف	١٥٥
١٤-	تربیتِ خودی ۔ تین مرحلے	١٦٣
١٥-	سنائی و اقبال	١٧٣
١٦-	علامہ اقبال سے ایک ملاقات	١٨٥
١٧-	دگر دانائے راز آید کہ ناید	١٨٩
١٨-	منظوم خراج عقیدت ۔ اردو، فارسی ، پنجابی	٢٠١
١٩-	اشاریہ	٢٠٧

عرض مرتب

صوفی غلام مصطفٰی تبسم کا نام قارئینِ ادب کے لیے جانا پہچانا ہے ، یوں تو مرحوم نے نصف صدی تک علم و ادب کی آبیاری کی مگر اس تمام مدت کے دوران اقبالیات کا مطالعہ اور اس کا فروغ ان کی زندگی کا بنیادی نصب العین رہا ۔ وہ بچوں میں ٹوٹ بٹوٹ کے شاعر کی حیثیت سے مقبول ہوئے اور بڑے انھیں صوفی تبسم کے نام سے جانتے ہیں ۔

علامہ اقبالؒ کے ساتھ صوفی تبسم کی عقیدت کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے ہوا اور تاحیات قائم رہا ۔ علامہ کے عقیدت مند کی حیثیت سے صوفی تبسم کا شمار ان خوش نصیب نیاز مندوں میں ہوتا ہے ، جنھوں نے پہلے بحیثیت طالب علم اقبال کی تخلیقات کا مطالعہ کیا ، بڑے ہو کر ان کی مجالس میں حاضری دینے کے ساتھ ساتھ ان سے علمی و ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات کر کے مستفید ہوئے اور پھر علامہ کے افکار و نظریات کو بحیثیت استاد اور شارح ایک طویل مدت تک طلبہ کی کئی نسلوں کے ذہنوں میں منتقل کرنے کا فریضہ انجام دیا ۔ علامہ اقبال کے ساتھ ایک متعلم ، نیازمند اور معلم کے رشتوں کے سبب انھیں علامہ اقبال کی شخصیت و فن کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا ۔

علامہ اقبال کے فکر و فن پر صوفی تبسم نے وقتاً فوقتاً تقاریر اور مضامین کی شکل میں جو کچھ لکھا وہ علامہ سے ان کی بھرپور ذہنی وابستگی کا نتیجہ ہیں ۔ یہ مواد مختلف کتب و رسائل اور اخبارات

میں بکھرا پڑا ہے ، ان میں سے جو مل سکا وہ یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان مضامین کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے تا کہ ہر مضمون کا سالِ تصنیف قاری کے ذہن میں رہے۔ اُمید ہے زیرِ نظر مضامین اقبالیاتؔ کے مطالعہ میں قابلِ قدر اضافے کا باعث ہوں گے۔

استادِ مکرم جناب ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کام میں جس طریق سے میری حوصلہ افزائی اور معاونت فرمائی اُس کے لیے ان کا سے شکرگزار اور معترف ہوں۔

ڈاکٹر محمد ریاض (صدر شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) ، صوفی تبسم کے بیٹوں کا بھی ممنون ہوں کہ ان کا تعاون اس کام کی تکمیل کا باعث بنا۔ پروفیسر مرزا محمد منور صاحب ناظم ، اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور کی مشفقانہ راہنمائی اور ذاتی دلچسپی بھی ان اوراق کی اشاعت کا سبب بنی ، جس کے لیے راقم ان کا بے حد ممنون ہے۔ صوفی تبسم کے بیٹوں نے بھی اس کام میں میرا ساتھ دیا۔ محبّی پروفیسر طیب منیر نے بھی مفید مشوروں سے نوازا چنانچہ ان کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے۔

نثار احمد قریشی

شعبۂ اردو
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد

مستقل پتہ

بیت القریش
محلہ حافظ آباد گوجر خان
(ضلع راولپنڈی)

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۔ سوانح اور تصانیف

صوفی غلام مصطفٰی تبسم ابن صوفی غلام رسول ، ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم کی ابتدا امرتسر ہی میں مفتی حکیم غلام رسول کے مطب سے ہوئی ۔ اس کے بعد چرچ مشن ہائی اسکول امرتسر سے میٹرک اور خالصہ کالج امرتسر سے ایف ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ اسی کالج میں بی ۔ اے میں داخلہ لیا مگر اسی زمانے میں علامہ عرشی امرتسری کی دوستی اور فیروز الدین طغرائی کی شاگردی میں شعر و شاعری کا ایسا چسکا پڑا کہ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ رہی جس کے نتیجے میں بی ۔ اے میں ناکام ہوگئے اور لاہور آ کر دوبارہ ایف ۔ سی کالج میں داخلہ لیا ۔ ۱۹۲۳ء میں ایف ۔ سی کالج سے فارسی آنرز کے ساتھ بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۲۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ایک سال میں ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا ۔

ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ آرمی میڈیکل ڈائرکٹوریٹ میں ملازمت کی مگر طبیعت میں شروع سے تدریس کا شوق تھا اس لیے یہ ملازمت ترک کر دی اور لاہور آ کر سنٹرل ٹریننگ کالج میں بی ۔ ٹی کلاس میں داخلہ لے لیا ۔ ۱۹۲۶ء میں تعلیم کا سلسلہ مکمل کر لیا ۔

بی ۔ ٹی کرنے کے بعد شروع میں گورنمنٹ ہائی اسکول امرتسر میں سینئر ٹیچر ہوئے پھر امرتسر میں ہی انسپکٹر آف سکولز مقرر

ہو گئے - ۱۹۲۷ء میں لاہور آ گئے اور سنٹرل ٹریننگ کالج میں السنہ شرقیہ کے لیکچرار مقرر ہوئے - سنٹرل ٹریننگ کالج سے ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گئے - ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر رشید احمد کے ریٹائر ہونے پر صدر شعبۂ فارسی ہو گئے - صوفی غلام مصطفٰی تبسم نے انٹر کولجیٹ نظام کے تحت پنجاب یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کی ایم - اے کلاسوں کو پڑھایا - گورنمنٹ کالج لاہور کا زمانہ اس لحاظ سے صوفی تبسم کی زندگی کا بہترین دور کہا جا سکتا ہے کہ اسی دور میں صوفی صاحب کو پطرس بخاری ، ڈاکٹر تاثیر اور عابد علی عابد کی ادبی دوستی میسر آئی - پطرس ، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کے ساتھ مل کر اس ادارے میں ایم - اے اردو کی کلاسوں کا اجراء ۱۹۵۰ء سے کیا جو بعد میں یونیورسٹی کے نظام کے تحت انٹر کولجیٹ طریق میں مدغم ہو گیا - بھرپور علمی ادبی فضا اور ڈرامیٹک کلب کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں صوفی تبسم نے نہایت اہم کردار ادا کیا - آپ گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۵۴ء میں ریٹائر ہوئے -

ریٹائر ہونے کے بعد خانۂ فرہنگ ایران لاہور کے پہلے کچھ عرصہ ڈائریکٹر اور بعد میں معلم مقرر ہوئے - اس دوران میں آپ سول سروس اکیڈمی اور فنانس سروسز اکیڈمی میں بنگالی طلبہ کو اردو بھی پڑھاتے رہے - مارچ ۱۹۶۱ء تا اپریل ۱۹۶۳ء مجلہ ''لیل و نہار'' کے مدیر اور جولائی ۱۹۶۴ء سے جون ۱۹۷۰ء تک ریڈیو پاکستان لاہور میں پہلے سٹاف آرٹسٹ اور بعد میں سکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کیا - اسی زمانے میں پاکستان ٹیلی وژن پر بھی ''اردو سبق'' کے نام سے ایک پروگرام پیش کرتے رہے -

۱۹۶۲ء میں صوفی صاحب کو گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے تمغہ و اعزاز کارکردگی اور ۱۹۶۷ء میں ''ستارہ امتیاز'' عطا ہوا - ایرانی حکومت نے آپ کو تمغۂ نشانِ سپاس سے بھی نوازا - اپریل

۱۹۷۵ء کو چیئرمین پاکستان آرٹس کونسل لاہور اور مارچ ۱۹۷۶ء کو وائس پریذیڈنٹ اقبال اکادمی لاہور مقرر ہوئے۔

شاعری کا آغاز امرتسر میں ہوا تھا۔ حکیم فیروز الدین طغرائی سے تلمذ رہا۔ پہلے اصغر تخلص اختیار کیا، بعد میں اپنے استاد کے مشورے سے تبسم تخلص رکھا۔ کسی زمانے میں 'شہباز کاشمیری' اور 'عرفانی کاشمیری' کے قلمی ناموں سے بھی لکھتے رہے۔ شاعر کے علاوہ مترجم افسانہ نگار، شارح اور نقاد بھی تھے۔

''لیل و نہار'' کے علاوہ رسالہ ''بلاغ'' امرتسر کے مدیر، ماہنامہ ''مخزن''، ''سکھی گھر'' کے اعزازی مدیر ماہنامہ ''اطفال'' اور پنجابی ادب کے نگران اور رسالہ 'پھول' کی مجلسِ مشاورت میں بھی شریک رہے۔

۷ فروری ۱۹۷۸ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال ہوا۔

تصانیف

(۱) ''انتخاب کلام اقبال''، مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان طبع اول، ۱۹۷۷ء۔

(۲) ''انتخابِ کلام امیر خسرو، طوطی شکر مقال'' مطبوعہ پیکجز لمیٹڈ، فیروز پور روڈ، طبع اول، ۱۹۷۵ء۔

(۳) ''اقبال اور بچے''، مطبوعہ پیکجر لمیٹڈ فیروز پور روڈ، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۰ء۔

(۴) ''انجمن'' (مجموعہ کلام) فارسی، اردو، پنجابی، مطبوعہ مکتبہ جدید، لاہور، بار اول، ۱۹۶۱ء۔

(۵) ''پنجاب کی شاعری پر فارسی روایات کا اثر''، مطبوعہ محکمہ تعلقات عامہ حکومتِ پنجاب، لاہور، (س - ن)۔

(۶) ''تیر و نشتر'' (اقبال کے اردو اشعار - انتخاب صوفی تبسم)، مطبوعہ پیکجز لمیٹڈ، لاہور، طبع اول، (س - ن)۔

(۷) ''تیر و نشتر'' (اقبال کے فارسی اشعار - انتخاب صوفی تبسم)، مطبوعہ پیکجز لمیٹڈ، لاہور، بار اول، (س - ن)۔

(۸) ''ٹوٹ بٹوٹ'' اور دوسری نظمیں (مصور) مطبوعہ مکتبہ میری لائبریری، لاہور، طبع اول، ۱۹۴۰ء۔ طبع دوم ۱۹۸۲ء، انڈس پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور، طبع سوم (مصور) ۱۹۸۲ء۔

(۹) ''جاہ و جلال''، مطبوعہ ڈرامیٹک کلب گورنمنٹ کالج لاہور، طبع اول، ۱۹۷۰ء۔

(۱۰) ''جھولنے''، مطبوعہ اردو اکیڈمی لاہور طبع اول، ۱۹۵۸ء - فیروز سنز لمیٹڈ لاہور پاکستان بار دوم، ۱۹۵۸ء۔

(۱۱) ''حرف و صوت'' (اردو/فارسی) انتخابِ کلام اقبال حصہ فارسی (صوفی تبسم)، حصہ اردو (احمد ندیم قاسمی)، شائع کردہ نیشنل کمیٹی برائے تقریبات صد سالہ جشنِ ولادت اقبال لاہور طبع اول، ۱۹۷۷ء۔

(۱۲) ''حکمت قرآن''، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور، طبع اول، (س - ن)۔

(۱۳) ''دوگونہ'' امیر خسرو کی سو غزلوں کا اردو غزل

میں ترجمہ، مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اول، ۱۹۷۵ء۔

(۱۴) دو ناٹک، ساون رین دا سُفنا۔ خطرناک لوک، مطبوعہ ایم جہانگیر اینڈ کمپنی ایجوکیشنل پبلیشرز، اردو بازار، لاہور، طبع اول، (س۔ن)۔
طبع دوم، ۱۹۶۴ء مکتبہ پنج دریا، ٹمپل روڈ، لاہور۔

(۱۵) ''روح غالب''، مطبوعہ گلوب پبلیشرز، لوہاری گیٹ لاہور، طبع اول، (س۔ن)۔

(۱۶) ''زندہ نغمے'' مرتبہ صوفی تبسم، میر نسیم محمود، ناصر کاظمی، مطبوعہ حامد محمود اینڈ کمپنی، لاہور، طبع اول (س۔ن)۔

(۱۷) ''سرا پردہ افلاک''، مطبوعہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۷ء۔

(۱۸) ''شرح صد شعر اقبال'' (جلد اول) اردو، مطبوعہ مرکزی آردو بورڈ، گلبرگ لاہور، طبع اول، نومبر ۱۹۷۷ء۔

(۱۹) ''شرح غزلیاتِ غالب'' (فارسی)، جلد اول و دوم، مطبوعہ پیکجز لمیٹڈ، لاہور، طبع اول، (س۔ن)۔

(۲۰) ''شعر فارسی معاصر''، (فارسی، اردو) مرتبہ صوفی تبسم، محمد حسین عرشی، شائع کردہ گلوب پبلیشنگ کمپنی، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، طبع اول، (س۔ن)۔

(۲۱) ''علامہ اقبال'' از آقای مجتبٰی مینوی، مترجم صوفی تبسم، مطبوعہ بزمِ اقبال، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور، طبع اول (س۔ن)۔

(۲۲) ''کلیاتِ طغرائی''، مرتبہ تبسم ایم اے، مطبوعہ مسلم پریس، لاہور، طبع اول، (س۔ن)۔

(۲۳) ''مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوق و سیاحت''، مطبوعہ پاکستان پبلشرز، میکلوڈ روڈ، لاہور، طبع اول (س۔ن)۔

(۲۴) ''نقش اقبال'' (فارسی کلام کا پنجابی ترجمہ)، مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان، گلبرگ، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۷ء۔

(۲۵) ''یک ہزار و یک سخن''، مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ، لاہور، طبع اول (س۔ن)۔

علامہ اقبال اور صوفی تبسم

عقیدتیں اور تعلقات

صوفی تبسم کا علامہ اقبال سے تعلق ان کے آخری دور کا ہے اور یہ تعلق نیاز مندی اور سخن فہمی کے سلسلے سمیٹے ہوئے ہے ۔ بقول ڈاکٹر تاثیر ''ان کی آمد بکثرت تھی اور علامہ اقبال انھیں فارسی محاورے اور زبان کا استاد بھی سمجھتے تھے ۔ اور سندات کے سلسلے میں انھیں کئی ارشادات کیا کرتے تھے ۔''[1] اس کے علاوہ صوفی صاحب کا علامہ اقبال سے تعلق مداح ہونے کا بھی رہا ہے ۔ وہ عمر بھر اقبالیات کی تشریح ، توضیح اور ترویج کے لیے کام کرتے رہے ۔ اس ضمن میں ان کی کئی حیثیتیں ہیں ۔ شارح ، مترجم ، فن شناس ، انتخاب کنندہ اور کارکنِ اقبالیات ۔

صوفی تبسم نے جب دنیا میں آنکھ کھولی ، اس وقت علامہ اقبال شعر و سخن میں شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے ۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے صوفی صاحب کو علامہ سے عقیدت ہو گئی تھی ۔ پہلے پہل بارہ برس کی عمر میں انھوں نے علامہ اقبال کا نام اپنے استاد قاضی حفیظ اللہ سے سنا اور ۱۹۱۱ء میں پہلی مرتبہ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں علامہ اقبال کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ اس کا ذکر صوفی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں کیا :

۱۔ اقبال کا فکر و فن ۔ از ڈاکٹر تاثیر ، مرتبہ افضل حق قرشی ، منیب پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۷ء ، ص ۱۲۶ ۔

"سب سے پہلے میں نے انھیں ۱۹۱۰ء میں حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شعر پڑھتے سنا۔ میرے والد مرحوم کو اس طرح کی محفلوں میں جانے کا بہت شوق ہوتا تھا۔ وہ ہر سال میلہ چراغاں کے موقع پر احباب کے ساتھ لاہور آ جاتے تھے۔"[۲]

صوفی صاحب نے دوسری بار علامہ اقبال کو ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں دیکھا۔ وہ جلیانوالہ باغ کے سانحہ سے متعلق مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ وہاں انھوں نے حکیم محمد اجمل خاں کی صدارت میں مندرجہ ذیل اشعار پڑھے :

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرہ نیساں ہے زنداں صدف سے ارجمند

مشکِ از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

"شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند"

تیسری بار ۱۹۲۰ء میں اپنے استاد حکیم فیروز الدین طغرائی کے ہمراہ امرتسر سے لاہور آئے اور علامہ کی محفل میں شریک ہوئے۔ اس محفل میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی اور چند دوسرے احباب شریک تھے۔ صوفی صاحب خوش گپیوں، پھبتیوں اور شعر و سخن کی اس محفل کا محض نظارہ کرتے رہے۔ اس زمانے میں وہ خالصہ

۲۔ اقبال کے شب و روز، انٹرویو صوفی تبسم۔ ریڈیو پاکستان لاہور، میزبان ناصر قریشی۔

کالج امرتسر کے طالب علم تھے اور علامہ سے باقاعدہ متعارف نہ تھے ۔

اس کے بعد بھی اکثر انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں علامہ کے نیاز حاصل کرتے رہے ۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایف ۔ سی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور نیاز مندی کا یہ سلسلہ آگے بڑھا ۔ ۱۹۲۳ء میں علامہ سے باقاعدہ ملاقات حافظ محمود شیرانی کے توسط سے ہوئی ۔ اس ملاقات کا تذکرہ بھی انھوں نے اپنے انٹرویوز میں کیا ۔ فرماتے ہیں :

> ”۲۳ - ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ میرے مرحوم استاد حافظ محمود شیرانی مجھے آن (علامہ) کے پاس لے گئے ۔ اس وقت وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے ۔ انھوں نے اس طرح میرا تعارف کرایا کہ یہ میرا طالب علم ہے اور وہاں سے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوا اور اس سلسلے کے بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے جو ہم جماعت اور دوست تھے ، ان میں ایک ڈاکٹر تاثیر تھے ، ہم ایک دوسرے سے پہلے آشنا تھے ، جب میں لاہور میں آیا تھا تو غائبانہ تعارف تھا ۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کے مضامین اور نظمیں پڑھتے تھے ، پھر ہم مل کر ان (علامہ) کے ہاں جایا کرتے تھے ۔“[۳]

یہ تو معلوم نہیں کہ صوفی صاحب کی علامہ سے خط و کتابت کب شروع ہوئی البتہ ستمبر ۱۹۲۵ء کے دو خط ہمارے سامنے ہیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صوفی صاحب کا علامہ سے باقاعدہ تعارف ہو چکا تھا ۔ خود لکھتے ہیں :

۳۔ اقبال کے شب و روز ریڈیو انٹرویو ، صوفی تبسم ۔

''اگرچہ میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور سے اپنے وطن چلا گیا تھا تاہم ان سے ملاقات کا اشتیاق ہمیشہ دامن گیر رہتا اور میں گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی عالمانہ گفتگو سے استفادہ کرتا رہتا۔''[۴]

ان خطوط کی تقریب یہ تھی کہ خواجہ احمد الدین امرتسر کے مشہور عالم دین تھے اس زمانے میں امرتسر سے رسالہ ''بلاغ'' شائع ہونا شروع ہوا۔ خواجہ صاحب کے مضامین اور قرآن حکیم کی تفسیر اس میں شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ علامہ اقبال کے ہاں باقاعدہ آتا اور وہ بالاستیعاب اس کا مطالعہ کرتے۔ علامہ ان سے متاثر تھے۔ اور ملاقات کے متمنی تھے۔ صوفی صاحب لکھتے ہیں :

''میری دلی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب کی ملاقات ہو۔ اور دونوں بزرگوں نے خود بھی باربا اس کے لیے انتہائی اشتیاق کا اظہار فرمایا لیکن یہ چیز ہمیشہ معرض التوا میں پڑی رہی۔ آخرکار ایک موقع آیا۔''[۵]

خواجہ صاحب سے ملاقات کا اشتیاق علامہ اقبال کے دونوں خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے ستمبر ۱۹۲۵ء میں یکے بعد دیگرے لکھے۔ ۲ ستمبر کے خط میں لکھتے ہیں :

''۔۔۔۔ مولوی صاحب موصوف کو میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے۔ اس واسطے وہ اگر مجھ کو

۴۔ راوی۔ مئی جون ۱۹۳۸ء ، اقبال نمبر ، ص ۱۳۳۔ بعد ازاں یہ تحریر ''بلاغ'' امرتسر ، اگست ۱۹۳۸ء اور پھر اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ ایضاً۔

پرائیویٹ

لاہور ۲ دسمبر ۳۰ء

جناب من — السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ آج صبح مجھے ملا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ بات کا

میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں جو اب تک

کوشش کیا کرتا ہوں کہ اس معلومات میں اضافہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر ذاتی اطمینان

کے لئے ہے نہ تعلیم و تعلم کی غرض سے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے انجمن کے لئے ایک مضمون لکھا تھا

[illegible] مضمون اس قدر پسند [illegible] آپ کے ابتدا

اگر دوران تحریر میں اس کا احساس ہوا تھا [illegible] موجودہ صورت میں وہ

[illegible] لکھا گیا تھا اب ہر تفصیلات کی زیادہ ضرورت ہے [illegible]

مضمون [illegible] سے [illegible] ابھی [illegible] کرتا ہے [illegible]

ضرورت ہے اس مضمون کے نہایت مختصر طور پر مختلف [illegible] بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال

[illegible] آج تک شائع نہیں کیا۔ اب [illegible] ایک [illegible] مستقل

[illegible] ہوگا [illegible]

[illegible]

اس عنوان سے مقصود یہ ہے کہ [illegible] ذاتی رائے تصور کیا جائے

جو ممکن ہے غلط ہو۔

احکام [illegible] ابدیت [illegible] کا [illegible] محدود ہوگا اور

[illegible] نوع انسان [illegible] بڑا [illegible] ہوگا۔ [illegible] تمام ممالک [illegible] مسلمان

بالخصوص انفرادی ذوق کی تربیت ہے یا قومی اصلاح ہے پر شعور و فکر کر رہے ہیں
(سعادت ایران و افغانستان کی) ہم لوگوں کی ہم سب سے اچھی جو دردا ہے سوال بہت!
ہوتا ہو دو اللہ ہی ہے نحو اور سب ہے کہ زمانہ حال کے پہلے فقہا یا تو زمانہ کے مسلمان
لغت ہے بالکل نئی چیز ہے یا فلسفہ تصوف ہی کا مبتدی ہے — ایران میں مجتہدین نے
وہ تنگ نظری اور تعصبات پرستی تھی بیادہ اللہ کو چند لوگوں کی جو مسیحا ہے اصلاح قرآن
ہی ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام فقہی اب بات تک جو اب تک اجماع کے تمام
دروازے بند ہیں جیسے ایک جیسے ہماری نظر آتی ہے حضرت امام
ابوحنیفہ کا لیکچر سنا ہے — غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے
ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید
تاریخ اسلام میں اب وقت اس سے پہلے کبھی نہ آیا۔

مخلص محمد آفتاب

امرتسر

چوک دروازہ لاہوری

جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم-اے ملاحظہ کریں

Amritsar City.

مستفیض کرنے کے ارادہ سے امرتسر سے لاہور آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو ان کی بہت مہربانی ہے - جس کے لیے میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں - مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے - کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں - جس میں عبادت و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو - معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے -''

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے علامہ اقبال سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا - اور اس سلسلے میں انھوں نے لاہور آنے کا قصد بھی کیا - صوفی صاحب لکھتے ہیں :

''اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ملاقات سے پہل دونوں بزرگوں نے زبانی اور تحریری طور پر نہایت عجز اور انکسار سے کام لیا - جیسا کہ اس خط کے انداز بیان سے ظاہر ہے - ہر ایک اس بات پر زور دیتا کہ ملاقات کا مقصد محض دوسرے سے استفادہ کرنا ہے اور بس -''[۶]

۶ ستمبر کو علامہ نے صوفی صاحب کو دوسرا خط لکھا - اس میں استفادے کی خواہش کا پھر اظہار کیا - لکھتے ہیں :

''میں کل شام مولوی صاحب کا منتظر رہا - لیکن چونکہ وہ تشریف نہ لائے - اس واسطے مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خط سے کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو - میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں وقت کی تعین اس واسطے نہ

۶- راوی مئی جون ۱۹۳۸ء ص ۱۳۳ -

کی تھی کہ اس بارے میں مولوی صاحب موصوف کی آسائش کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی عنایت کم نہیں کہ وہ محض میرے فائدے کے لیے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں۔ یہ بات قرین انصاف نہیں کہ ان حالات میں میں اپنی سہولت اور اوقات ملحوظ رکھوں۔ مجھ کو یہ بات اس خط میں واضح کر دینی چاہیے تھی کہ وہ جب چاہیں تشریف لائیں مجھ کو صرف ایک روز پہلے مطلع کریں تا کہ میں ان کی تشریف آوری کے وقت مکان میں ہی رہوں۔ کہیں ادھر ادھر نہ چلا جاؤں۔ آپ کو گذشتہ خط لکھنے کے بعد میں نے چند باتیں نوٹ بھی کر رکھی تھیں۔ جن پر مولوی صاحب کے خیالات سے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا آرزو مند ہوں۔

مخلص

محمد اقبال

مولوی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کر دیجیے گا۔"

بعد میں خواجہ احمد الدین کی علامہ سے ملاقات لاہور میں ہوئی۔ صوفی صاحب بھی اس ملاقات کے وقت موجود تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ بھی تھے۔ ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے صوفی صاحب لکھتے ہیں :

"مولانا احمد الدین لاہور تشریف لائے۔ اور میں ان کی معیت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دونوں بزرگوں میں مسلسل چار گھنٹے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مابعد الطبیعات اور الٰہیات کا شاید

لاہور ۶ ستمبر ۲۵ء

جناب من السلام علیکم

میں کل تمام شام مولوی صاحب کا منتظر رہا لیکن چونکہ وہ تشریف نہ لائے
اس واسطے مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خط سے کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو
میں نے آپ کا پیام دیا تھا وقت وغیرہ اس واسطے نہ لکھا کہ اس طرح اس بارے
میں مولوی صاحب موصوف کی آسائش کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی
یہ عادت کہ نہیں ہے کہ صبح میرے ناشتہ کے لئے تشریف لائیں اور تکلیف گوارا
فرمائیں۔ یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ ان کے اوقات میں اپنی سہولت اور
اوقات کو ملحوظ رکھوں۔ مجھ کو یہ بات اس خیال سے مدنظر رکھنی چاہئے تھی
کہ وہ جب چاہیں تشریف لائیں۔ مجھ کو ہر ایک روز پچھلے پہر فراغت رہتی ہے
جس وقت چاہیں تشریف لائیں اور جس وقت چاہیں پھر آ جائیں اگر میں گیا اور نہ آیا تو جلد جاؤں
باقی موضوع گفتگو کے متعلق اگر ان کی جانب سے احکام ہیں تو اور بہت سے امور ہیں جن کا

تمنا تھی کہ آپ سے فائدہ اٹھاتا رہوں ۔ جب مہربانی کرکے میری [illegible]

سے بہتر تو ثابت ہوا ہے دنیا سے فائدے اٹھانے کو تیار ہے

آپ کا نسخہ حساب [illegible] جس سے بالکل [illegible] تحریر کی [illegible]

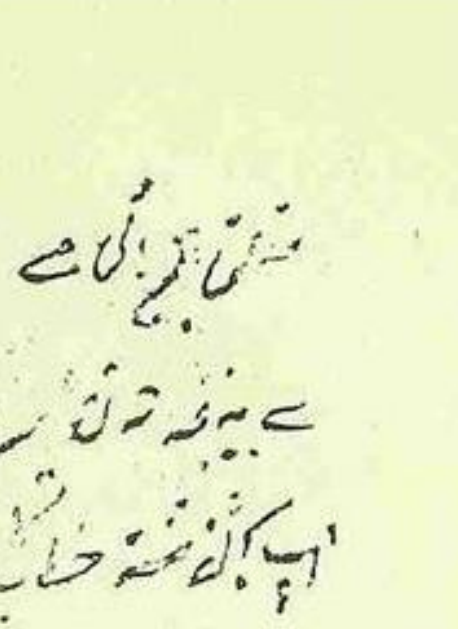

بڑی [illegible] [illegible] [illegible]

مخلص محمد اقبال

مولوی صاحب [illegible] پر [illegible] علم [illegible] کردیں گے

امرتسر شہر چوک دروازہ لاہوری

جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم اے ملاحظہ فرمائیں

Amritsar City

ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو ، جو زیر بحث نہ آیا ہو - یہ بابرکت صحبت رات کے ایک بجے ختم ہوئی - اس صحبت میں شریک ہونے والے میرے محترم دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی ایچ - ڈی بھی تھے -''[۷]

خواجہ صاحب کے علاوہ صوفی صاحب علامہ اقبال اور محمد حسین عرشی امرتسری کی ملاقات کا واسطہ بھی بنے - عرشی صاحب صوفی تبسم کے دوستوں میں سے تھے - اور امرتسر میں ان کے ہمسائے تھے - ''جاوید نامہ'' کی اشاعت کے بعد عرشی صاحب نے صوفی تبسم کے ایما پر میکلوڈ روڈ پر علامہ سے پہلی باقاعدہ ملاقات کی اس کی تفصیل خود عرشی صاحب لکھتے ہیں :

''- - - - کلام حلاج کے بعض حصوں پر دل میں خلش پیدا ہوئی ، میں نے پروفیسر صوفی تبسم سے اس کا ذکر کیا - انھوں نے لاہور پہنچ کر میری بات علامہ تک پہنچا دی - انھوں نے جو کچھ فرمایا مجھے اس وقت یاد نہیں - لیکن میں اس پر مطمئن نہ ہو سکا - اسی طرح ادھر سے تردد ، ادھر سے توجیہہ و تشریح ہوتی رہی - آخر صوفی صاحب نے کہا ''یہ بات روبرو بیٹھ کر ہی صاف ہو سکتی ہے -'' سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس میں ہچکچاہٹ تھی ، آخر یہ طے پایا کہ صوفی صاحب میرا تعارف کرائے بغیر یہ مسئلہ چھیڑ دیں گے - اور سرسری طور پر اپنے شکوک عرض کر دوں گا - چنانچہ ہم چند احباب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے - یہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے جبکہ آپ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے - صوفی صاحب نے میرے منشا کے خلاف

۷- راوی سئی جون ۱۹۳۸ء ص ۱۳۳ -

جاتے ہی میرا تعارف کرا دیا ۔ بات شروع ہوئی ، چھ سات مرتبہ ادھر سے سوال ، اُدھر سے جواب کا سلسلہ چلا ۔ آخر میں میں نے محسوس کیا کہ وہ اس پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتے ۔''[۸]

گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے میں ایک بار صوفی صاحب کو غالب کا ایک شعر سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی[۹] ۔ خیال آیا کہ علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں ایک حوالے سے اس شعر کی تشریح کی ہے[۱۰] ۔ لہٰذا ان سے رجوع کرنا چاہیئے ۔ چنانچہ کلاس میں جانے سے پہلے صبح ہی صبح علامہ کے ہاں حاضر ہوئے اور اپنا مدعا بیان کیا ۔ علامہ نے جواب میں فرمایا کہ اس شعر کی تشریح تو میں نے جاوید نامے میں کی ہے ۔ صوفی صاحب نے عرض کیا کہ اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں ۔ ذہن میں کچھ الجھنیں ہیں ۔ علامہ نے علی بخش کو بلایا تا کہ ''جاوید نامہ'' میں درج اس شعر کی تشریح دیکھی جائے ۔ حضرت علامہ نے صوفی صحاب کو ''جاوید نامہ'' کے وہ اشعار پڑھنے کے لیے کہا مگر صوفی صاحب نے علامہ سے درخواست کی کہ یہ اشعار آپ خود پڑھیں ۔ علامہ نے اشعار پڑھے اور ان کے انداز ہی سے صوفی صاحب کی الجھن رفع ہو گئی ۔

۸۔ نقوشِ اقبال ، تالیف پروفیسر رازی ایم اے و علامہ عرشی ، شائع کردہ ایم جہانگیر اینڈ کمپنی اردو بازار لاہور ، ص ۲۳۲ تا ۲۴۰ ۔

۹۔ غالب کا شعر ہے :

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

۱۰۔ علامہ کے اشعار یہ ہیں :

نالہ کو خیزد از سوز جگر ہر کجا تاثیر او دیدم دگر !
قمری از تاثیر او وا سوختہ بلبل ازوے رنگہا اندوختہ !

کلیاتِ اقبال ، حصہ جاوید نامہ ، ص ۱۲۵ ۔

ایک دفعہ بڑی جسارت کی ''اسرار خودی'' چھپی تو اس میں بام کا لفظ آیا ۔ عرض کیا کہ آپ نے اپنی مثنوی میں بام کو صبح کے معنی میں لکھا ہے ۔ کہنے لگے ''ہاں کیا بات ہے'' صوفی صاحب نے کہا ''نہیں جی بات تو کوئی نہیں'' اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے ۔ علامہ ان کی الجھن کو سمجھ گئے ۔ فوراً اساتذہ کے دو تین اشعار سنا دیے ۔ جن میں لفظ بام انہی معنوں میں آیا تھا ۔ صوفی صاحب کہتے ہیں ''بڑی شرمساری ہوئی ۔ علامہ کا حافظہ بلا کا تھا[11] ۔''

صوفی صاحب کے علامہ سے تعلقات شوخی کی حد تک پہنچے ہوئے تھے ۔ ڈاکٹر تاثیر بیان کرتے ہیں ۔ ''صوفی تبسم ان چند دست دراز لوگوں میں سے تھے جو ڈاکٹر صاحب کے حقے پر ہاتھ ڈال دیا کرتے تھے[12] ۔'' ایک دفعہ ''بال جبریل'' ابھی پریس میں تھی تو پطرس بخاری اس کے پروف لے آئے تھے ۔ انھوں نے صوفی تبسم سے کہا کہ ''چند بہترین طالب علموں کو جمع کرو ہم شعر پڑھیں گے ۔ میں پروف لایا ہوں ۔'' صوفی صاحب کا بیان ہے کہ ''ایک گھنٹہ انھوں نے شعر بڑھ کر سنائے تو اسی شام ہم علامہ کے ہاں پہنچ گئے ۔ ہم نے کہا ''جی وہ شعر'' ۔ ۔ ۔ ۔ کہنے لگے ۔ ''آپ کو اس کا کیسے پتا چلا ۔'' تو ہم نے کہا ''جی آپ کو الہام ہوتا ہے تو ہمیں ان شعروں کا القا ہو جاتا ہے ۔ عقیدت کی وجہ سے[13] ۔''

علامہ اقبال سے آخری زمانے کی ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے صوفی تبسم تحریر کرتے ہیں ۔

''دفعتاً فرمانے لگے ۔ ہاں تو مجھے یاد آیا ، کوڑا کرکٹ

---

۱۱ - ریڈیو انٹرویو ۔
۱۲ - اقبال کا فکر و فن از ڈاکٹر تاثیر مرتبہ افضل حق قرشی ص ۱۲۶ ۔
۱۳ - ریڈیو انٹرویو ۔

اور گندگی کے ڈھیر کے لیے فارسی میں کون سا لفظ ہے سوچتا تھا ۔ تم آؤ تو پوچھوں ۔" میں نے عرض کیا "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں ؟"

کہنے لگے "واقعی آپ فارسی پڑھاتے ہیں نا ، خیال تھا کوئی موزوں لفظ مل جائے گا" میں نے دو تین الفاظ پیش کیے۔ فرمایا کہ "یہ پہلے سے میرے ذہن میں ہیں ۔ میں کوئی زیادہ موزوں لفظ چاہتا ہوں ۔ ایک ایسے دماغ کے لیے تشبیہہ کی ضرورت ہے جس کا ظاہر تو خضر الدمن کی طرح عارضی طور پر شگفتہ نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر گندگی بھری ہوئی ہے ۔ ایک رباعی لکھنا چاہتا ہوں اس کے لیے لفظ کی تلاش ہے ۔"

پیشتر اس کے کہ ہم پوچھتے وہ دماغ کون سا ہے وہ خود بول اٹھے ۔ ہماری قوم کے اکثر اصحاب فکر کے دماغوں کی یہی کیفیت ہے ۔"[۱۳]

صوفی صاحب اکثر علامہ کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے ان کے ساتھ جو احباب اور شاگرد ہوا کرتے تھے ان میں خواجہ صاحب اور عرشی صاحب کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر ، سراج نظامی ، عبدالرشید طارق ، حفیظ ہوشیارپوری سید الطاف حسین ، اور خضر تمیمی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

ایک ملاقات میں صوفی صاحب نے بابو کرم کا تعارف کرایا ، بابو کرم نے اپنی چند پنجابی کی نظمیں سنائیں جو ڈاکٹر صاحب نے پسند فرمائیں عبدالرشید طارق نے اس کا تذکرہ کیا ہے ۔ صوفی صاحب کے ساتھ ان محفلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ۔

۱۳۔ "ماہ نو" اقبال نمبر ، ۱۹۷۷ء ص ۳۶۶ ۔

"ایک روز جب کہ میں صوفی غلام مصطفٰی تبسم اور بدرالدین بدر اور پنجابی کے مشہور شاعر بابو کرم، سراج صاحب اور انک اور درست ان کے پاس بیٹھے تھے تو کانگریس اور مسلم لیگ کا تذکرہ چھڑا ۔ ۔[15]

جب علامہ اقبال کی اہلیہ اور جاوید اقبال کی والدہ نے انتقال فرمایا تو صوفی صاحب چند ہی لمحوں بعد وہاں پہنچ گئے ۔ وہ تو شاید کسی مبارک باد کے سلسلے میں وہاں پہنچے تھے مگر علی بخش نے پورچ ہی میں انھیں ان کی رحلت کی اطلاع دے دی ۔ عبدالرشید طارق لکھتے ہیں :

" ۔ ۔ ۔ ہمارے دل پر جو گزری محتاج بیان نہیں ہم دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے درمیانی کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا ڈاکٹر صاحب دائیں جانب طعام گاہ کے دروازے کے قریب فرش پر سر جھکائے بیٹھے تھے ۔ ہمارے سلام کی آواز سن کے انھوں نے سر اٹھایا اور ہمیں پہچان کر کہا اچھا ہوا آپ آ گئے میں بالکل اکیلا تھا[16] ۔ ۔ ۔ ۔"

صوفی صاحب علامہ کے حقے پر ہاتھ ڈال دیا کرتے تھے ۔ یہ بات ڈاکٹر تاثیر نے تو بیان کی ہے ، خضر تمیمی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ۔

"ہم میں سے ممدوح کے ساتھ حقہ پینے کا شرف صرف

۱۵- مے شبانہ از عبدالرشید طارق مشمولہ ملفوظات ، مرتبہ محمود نظامی لاہور ، ص ۲۱۶ تا ۲۱۷ ۔
۱۶- ایضاً ، ص ۲۲۳ ۔

صوفی صاحب قبلہ کو حاصل ہوا[۱۷] ۔

سید الطاف حسین نے اپنی ملاقاتوں کے تذکرے میں بھی صوفی تبسم کی معیت کا ذکر کیا ہے ، وہ لکھتے ہیں ۔

''پہلی ملاقات دو ہم جماعت عزیزوں کے علاوہ پروفیسر صوفی غلام مصطفٰی تبسم کی معیت میں نصیب ہوئی ۔''[۱۸]

حفیظ ہوشیار پوری لکھتے ہیں :

''اس کے بعد دو تین مرتبہ پروفیسر تبسم کے ساتھ ، ایک دفعہ عرشی صاحب کے ساتھ اور اکثر تنہا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ۔ ۔ ۔ ایک دفعہ عرشی صاحب اور تبسم صاحب کی معیت میں آپ کے پاس گیا تو ان مضمونوں اور نظموں کا ذکر چھڑ گیا ۔ جو آج کل اردو کے عام رسالوں میں شائع ہوتی ہیں[۱۹] ۔''

علامہ اقبال کے ساتھ صوفی تبسم کی عقیدت کا سلسلہ جو زمانہ طالب علمی سے قائم ہوا تھا ۔ اٹھارہ برس تک ان سے ملاقاتوں کی صورت میں قائم رہا ۔ ۱۹۳۲ء میں صوفی صاحب نے ''علامہ اقبال کی شاعری'' کے عنوان سے علامہ کی زندگی ہی میں ایک طویل مقالہ تحریر کیا ''جسے علامہ نے سراہا[۲۰] ۔'' اسی سال اورینٹل کالج میگزین لاہور (اگست ۱۹۳۲ء) میں صوفی صاحب نے علامہ کے حکم کی تعمیل میں نصیر الدین ہاشمی کی کتاب ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' پر تبصرہ تحریر کیا ۔

۱۷- اقبال کے ہاں از خضر تمیمی مشمولہ ملفوظات مرتبہ محمود نظامی ، ص ۱۹۱ ۔

۱۸- چند ملاقاتیں از سید الطاف حسین ، ایضاً ص ۱۷۱ ۔

۱۹- عمر عزیز کے بہترین لمحے از حفیظ ہوشیارپوری ایضاً ص ۱۳۶ ۔

۲۰- زیر نظر کتاب میں یہ مقالہ شامل ہے ۔

علامہ کے بعد تو صوفی صاحب نے گویا علامہ کے فکر و فن کی تشریح اور ترویج کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا ۔ انھوں نے اردو ، پنجابی ، انگریزی اور فارسی میں جتنا کچھ لکھا اس کا ایک تہائی اقبالیات پر مشتمل ہے ۔ اپنی عمر کے چند برس تو انھوں نے صرف اقبالیات کے فروغ و اشاعت کے لیے وقف کر دیے تھے فروری ۱۹۷۶ء میں صوفی صاحب کی انہی خدمات کے پیش نظر انھیں اقبال اکادمی کا وائس پریزیڈنٹ بنا دیا گیا ۔ اور تا دم آخر وہ اس عہدے پر رہے ۔ علامہ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں انھوں نے اقبال اکادمی کے لیے بڑی محنت سے کام کیا ۔ انٹرنیشنل کانگریس ۱۹۷۷ء کے سلسلے میں بھی انھوں نے معتدد انتظامی کمیٹیوں میں بھر پور کردا ادا کیا ۔ ان خدمات کے اعتراف کے طور پر پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ایک تمغہ پیش کیا ۔ ۱۹۷۸ء میں پنشنرز ویلفئیر ایسوسی ایشن لاہور نے علامہ اقبال پر بہترین کتب تحریر کرنے والے ادیب کے لیے علامہ اقبال میڈل صوفی صاحب کو دیا ۔ محکمہ اطلاعات پنجاب کی جانب سے اقبال میوزیم منعقدہ ۱۹۷۵ء لاہور میں صوفی صاحب کی خدمات کو سراہا گیا ۔ اور انھیں مجسمہ اقبال پیش کیا گیا ۔ مجلس انتظامیہ یوم اقبال کراچی ۱۹۶۶ء نے صوفی صاحب کو ان کی خدمات کے پیش نظر مجسمہ اقبال اور تعریفی سند پیش کی ۱۹۷۵ء میں جب صوفی صاحب پاکستان آرٹس کونسل کے چیئر مین بنائے گئے تو پہلی بار یہاں ہفتہ وار اقبال لیکچر اور تنقیدی مجالس کا اہتمام ہوا ۔ اقبالیات کی ترویج و فروغ کے سلسلے میں صوفی صاحب نے ان تھک کام کیا ۔ حتٰی کہ اپنے سفر آخرت (۷ فروری ۱۹۷۸ء) کے وقت بھی صوفی صاحب اقبال میموریل فنڈ کے سلسلے میں ٹیلی ویژن پر قوم سے اپیل کرنے اسلام آباد گئے ہوئے تھے واپسی پر لاہور اسٹیشن پر انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔

اقبالیات کے ضمن میں صوفی صاحب کی تحریری کاوشوں کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے :

۱- علامہ اقبال کے نام سے ۱۹۵۵ء میں صوفی تبسم نے ایک ایرانی پروفیسر مجتبٰی مینوی کی فارسی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جسے بزم اقبال لاہور نے شائع کیا۔ صوفی صاحب کے قلم سے علامہ اقبال سے متعلق کتابی شکل میں شائع ہوئے والی یہ پہلی کوشش تھی۔

۲- تیر و نشتر کے نام سے صوفی صاحب نے علامہ اقبال کے سو فارسی اور سو اردو اشعار کا انتخاب کیا اور ان اشعار کو موصوف نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا۔ پیکجیز لمیٹڈ لاہور نے ان دونوں جیبی سائز کتب کو بسلسلہ صد سالہ جشن ولادت علامہ اقبال ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۳- انتخاب کلام اقبال (اردو۔ فارسی) کے نام سے صوفی تبسم کا یہ انتخاب اقبال اکادمی لاہور نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۴- نیشنل کمیٹی برائے تقریبات صد سالہ جشن ولادت اقبال نے نغمہ خوانی کے لیے ترتیب دیا گیا کلام اقبال ''حرف و صوت'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ اس انتخاب میں اقبال کا فارسی کلام صوفی تبسم کا انتخاب کردہ ہے۔

۵- اقبال کا ایک شعر ریڈیو پاکستان لاہور سے صوفی تبسم کا ایک مسلسل پروگرام تھا۔ جسے مرکزی اردو بورڈ لاہور نے صد شعر اقبال جلد اول (اردو) کے نام سے ۱۹۷۷ء میں کتابی شکل میں شائع کیا [۲۱]۔ ''اقبال کا ایک شعر'' پروگرام میں ریڈیو سے صوفی صاحب نے اقبال کے فارسی اردو اشعار اور فارسی اردو کے علاوہ دیگر بہت سے شعراء کے تین چار سو شعروں کی شرح کی۔ فارسی اشعار کی شرح ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

۲۱- ادارۂ مصنفین پاکستان لاہور نے اس کتاب کو ۱۹۸۰ء میں تین ہزار روپے کا انعام دیا۔

۶- نقش اقبال - اقبال کے فارسی کلام کا منظوم پنجابی ترجمہ ہے - یہ کتاب اقبال اکادمی لاہور نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی - کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے ان تراجم کے بعض حصے روزنامہ امروز لاہور اور دیگر رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے -

۷- ''سرا پردہ افلاک'' - ''جاوید نامہ'' ، کا آزاد منظوم اردو ترجمہ ہے اور بقول صوفی تبسم ''اس آزاد ترجمے کے نظمی خط و خال تمثیلی منظر کے مزاج کے مطابق بدلتے چلے جاتے ہیں[۲۲] - ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور نے یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع کی -

۸- ''اقبال اور بچے'' (انتخاب) بچوں کے لیے اقبال کی نظموں کے اس انتخاب کو صوفی تبسم نے ترتیب دیا ، تصاویر عائشہ تسلیم نے بنائیں اور پیکیجز لمیٹڈ لاہور نے اس کتاب کو صوفی تبسم کی وفات کے بعد شائع کیا -

---

۲۲- پیش لفظ - سرا پردۂ افلاک ، ص و -

علامہ اقبال کی شاعری*

کسی فن کار کے کمالاتِ فن پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس فن کے لوازمات کو سمجھنا اور اس کا ایک صحیح معیار قائم کرنا از بس ضروری ہے۔ اس کے بغیر تنقید و تبصرہ کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جواہرات کو پرکھنے کے لیے نظر درکار ہے۔ یہاں نظر سے مراد یہی معیار ہے جس کے ذریعہ نہ صرف ہم کھوٹے کھرے میں تمیز کر سکتے ہیں۔ بلکہ جواہرات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ لازمی ہے کہ شاعری کا صحیح اور معیاری مفہوم ہمارے ذہن میں ہو۔

شاعری کیا ہے؟ شعر اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟ مشرق و مغرب کے مختلف نقادان فن نے اپنے اپنے معیار، اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور طرح طرح

---

* صوفی تبسم نے یہ مقالہ ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال کی زندگی میں تحریر کیا جسے ماہنامہ نیرنگِ خیال لاہور نے اسی سال اقبال نمبر میں شائع کیا۔ گورنمنٹ کالج کے مجلہ "راوی" کے صد سالہ اقبال نمبر اپریل ۱۹۷۴ء میں بھی یہ مقالہ (صفحات ۳۰ - ۴۴) شائع ہوا اور راوی کے مذکورہ شمارے کے ص ۳۱ پر ادارے نے یہ نوٹ تحریر کیا "یہ مقالہ حضرت علامہ کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا اور آنھوں نے اس کو بے حد سراہا تھا"۔ "نقوش" اقبال نمبر نومبر ۱۹۷۷ء میں یہ مقالہ قدرے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا (صفحات ۱۸۷ - ۲۰۵) زیر نظر مقالہ اضافہ شدہ صورت میں پیش خدمت ہے۔ (مرتب)

کی گل افشانیاں کی ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ شعر منظوم کلام کا نام ہے ۔ الفاظ کی برجستگی ، تراکیب کی چستی انداز بیان کی سادگی کا نام ہے ۔ اگر ان ظاہر پرست ، ناقدان فن کے اس مادیت آگیں نظریہ کو درست تسلیم کر لیا جائے تو لکھنؤ کے ایک چرب زبان ، شوخ گفتار پان فروش لونڈے کی موزوں گفتگو ، فسانۂ عجائب کی مقفیٰ عبارت شیخ ناسخ کی منظومات اور غالب مرحوم کے شعری الہامات میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ صاحب ذوق سمجھتا ہے کہ شاعری کا یہ معیار پست شعر کو بام فلک سے حضیض ثریٰ میں گرا دیتا ہے ۔ یہ ایسی ذلت ہے جسے شیدان شعر و شاعری کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتے ۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسا کلام ایک بت ہے جس کا جسم حسین خط و خال ، جمیل نقش و نگار تو رکھتا ہے لیکن روح غائب ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ شاعری علوے تخیل کا نام ہے ۔ بلند اور لطیف جذبات و احساسات کا نام ہے ۔ جو الفاظ کی قید و بند سے آزاد بذات خود مستقل حیثیت رکھتے ہیں ۔ اگر یہ درست ہے تو ایک فلسفی کے تخیلات کی آزاد بلند پروازیاں بزرگان دین کے الہامی فقرات عاشقان تفتہ جگر کی دل ہلا دینے والی فریادیں شعر کہلانے کی مستحق ہیں ۔ شعر اور جذبات و احساسات کے عام اظہار میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا ہے ۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہے کہ دنیا کے تمام صنعت گر یا فن کار تخیل ہی کی بدولت دنیا میں اپنا نام روشن کرتے ہیں ۔ آن کا آئینہ دماغ دوسروں کی نسبت زیادہ جاذب نقوش ہوتا ہے ۔ آن کے دل عوام کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں ۔ وہ قدرت کے جلووں کو دیکھتے ہیں ۔ وہ فطرت کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ کائنات کا ہر ذرہ ان کے لیے حسین و جمیل ہے دنیا کا ہر واقعہ آن کے لیے آئینہ عبرت ہے ۔ وہ ہر لحظہ ہر شے میں ایک نئی حقیقت کو جلوہ گر دیکھتے ہیں اور اس احساس حسن ، اس درس عبرت ، اس فلسفہ حقیقت کے اظہار کے لیے اپنے آپ کو مجبور

پاتے ہیں ۔ تمام فنون لطیفہ کے ماہرین کا یہی حال ہے ۔ لیکن کیا ان میں سے ہر ایک کے اظہار کی نوعیت ایک سی ہے ۔ کیا ہر ایک کے صنعتی نتائج یکساں ہیں ۔ معمار کا عرض فن معماری ، مصور کا اظہار کمال مصوری اور شاعر کا نتیجہ' فکر شاعری ہے ۔ پس کوئی چیز ہے جو ان تینوں اہل فن کے انداز بیان کو جن کے احساسات عالم تصور میں کم و بیش مساوی درجہ رکھتے تھے ۔ ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں کیوں ایک معمار اپنے فن کے اظہار کے لیے خشت و سنگ تلاش کرتا ہے ۔ کیوں ایک مصور رنگ آمیزی اور شاعر الفاظ آفرینی سے کام لیتا ہے ؟ یہی شے ان تینوں صنعت گروں کے کمالات فن کو جدا گانہ حیثیت سے سرفراز کرتی ہے ۔

پس نہ تو محض لفظ آرائیوں کا نام شاعری ہے اور نہ محض تخیل کی بے قید و بند بلند پروازیوں کا ، دونوں کا وجود نہایت ضروری ہے ۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ لیکن ان لفظ آرائیوں کی نوعیت کیا ہے ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک معمار اپنے تخیلی تعمیرات کو ظاہری موزونیت سے آراستہ نہیں کرتا اس کا نتیجہ' فن شاہکار کی حیثیت اختیار نہیں کرسکتا ۔ اسی خاص موزونیت نے دنیا کی عظیم الشان عمارات کو صنعت گری کا بہترین نمونہ بنا دیا ہے ۔ اگر مصور اپنے خاص انداز میں رنگ آمیزیوں سے کام نہ لے تو اس کے نقوش فنی اعتبار سے ناقص رہ جائیں ۔ ایک عام معمار کی غیر صنعتی تعمیر ، اور ایک ماہر فن صنعت گر کے شاہکار میں وہی فرق ہے جو ایک خشت و سنگ کے ڈھیر اور تاج محل میں ہے ۔

پس دوسرے فن کاروں کی طرح شاعر کو بھی اظہار خیال کے لیے موزوں ذرائع کی ضرورت ہے ۔ جو اس کے جذبات و احساسات کی کماحقہ ، ترجمانی کر سکیں ۔ اور اس کے تخییلی مجسمات کو زندہ کر دینے میں ممد ہوں ۔ اگر موزوں اور مؤثر الفاظ میسر نہ آئیں تو تخیلات اندازِ بیان کی نامربوط فضا اپنی ہستی کھو بیٹھتے ہیں ۔ اور

اگر علوئے تخیل ، جذبات و احساسات کی لطافت مفقود ہو تو محض الفاظ تراشی بت گری ہوگی ۔ شاعری نہ ہوگی ۔ موثر پیرایہ' بیان اور تخیل کا امتزاج ایسا ہی ہے جیسے کسی جری ، دلیر بہادر سپاہی کے ہاتھ میں تلوار لیکن بلندی خیال کے بغیر الفاظ نگاری کی وہی حیثیت ہوگی ۔ جو تلوار کسی نامرد کے ہاتھ میں جو بالکل اس شعر کے مصداق ہے ۔ ع

نامرد کے ہاتھ میں پہنچ کر شمشیر ، نیام ہو گئی ہے[1]

جب علوئے تخیل کے ساتھ دلکش انداز بیان شامل ہو جائے ۔ جب الفاظ و معانی اپنی لطافت و وسعت کو قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں جذب ہو کر "او درمن و من دروے چوں بوئے بگلاب اندر" کا ورد کرتے ہوئے نظر آئیں ۔ جب دونوں کی آمیزش اس شراب و شیشہ کے وصال کی طرح ہو ۔ جنھیں دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہو کہ شراب شیشے میں ہے یا شیشہ شراب میں ۔ سمجھ لیجیے کہ شاعر اپنی مساعی میں کامیاب ہو گیا ہے اور صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے اس کا شاہکار کہلانے کا مستحق ہے ۔

خیالات کی بلند آہنگی ، جذبات کی لطافت ، الفاظ کی برجستگی ، انداز بیان کی موزونیت ، اور پھر دونوں کی باہمی لطیف آمیزش جس قدر زیادہ کامیاب ہوگی ۔ اسی قدر شاعر کا کمال اور شاعری کا معیار بلند ہوگا ۔

آج سے چند سال پیشتر حضرت اقبال کی شاعری کے متعلق دو متضاد رائیں سننے میں آتی تھیں ۔ اور آج بھی جب کہ ان کے کمال فن کے اظہار نے متعدد تصانیف کی صورت اختیار کر لی ہے ۔ یہ اختلاف رائے بعض حلقوں میں دیکھنے میں آتا ہے ۔ ایک گروہ انھیں ہندوستان بلکہ ایشیا کا بہترین شاعر مانتا ہے ۔ اور دوسرے

۱۔ کلیات اسمٰعیل میرٹھی ، ص ۲۸۳ ، شائع کردہ اورینٹل پبلشنگ کمپنی ، ۲۳۸ اورینٹل ہاؤس میرٹھ ۱۹۱۰ء ۔

گروہ کو اپنی پست ذہنیت اور کور ذوق کے باعث اس میں شک ہے یہ موخر الذکر ادبی کافروں کا گروہ اگر کبھی اپنی بد مذاقی کے اخفا کی غرض سے آن کے کمالات شاعری کا اعتراف دبی زبان میں کرتا بھی ہے تو عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے اصحاب کی تحسین ''تحسین نا سخن شناس'' کا حکم رکھتی ہے ۔ حضرت اقبال کی شاعری تو خیر ایک بلند شے ہے ۔ کسی معمولی شاعر کے کلام کو سمجھنے اور اس کی صحیح داد دینے کے لیے سلیم المذاق ہونا نہایت ضروری ہے ۔ اور حق تو یہ ہے کہ شعر گوئی کی طرح شعر فہمی بھی ایک فطرتی عطیہ ہے جو اکتساب علم سے حاصل نہیں ہو سکتا ۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ[۲]

بسا اوقات ایک فاضل اجل ، ایک ماہر عروض ، ذوق سلیم سے عاری ہونے کے باعث شعر و سخن کی گونا گوں دلچسپیوں سے لذت اندوز نہیں ہو سکتا ۔ وہ اس اندھے کی طرح ہے جو کسی باغ میں فضائے رنگ و بو کی سیر کے لیے نکل آئے اور اپنی کوشش میں ناکام رہنے پر باغ کی شکایت کرے ۔

مذاق کی بلندی اور پستی کے ظاہری اختلاف کے علاوہ حضرت اقبال کے کلام میں ایک خصوصیت اور بھی ہے جو بعض اوقات اشعار کی تہہ تک پہنچنے میں حارج ہوتی ہے وہ آن کے تخیل کی فلسفیانہ دقت طرازیاں ہیں ۔ وہ لوگ جو آن کے کلام کو محض تفریح کی غرض سے دیوان داغ کی طرح اکھاڑ کر پڑھنے اور اس سے لذت اندوز ہونے کے متمنی ہیں ۔ اکثر مایوس ہو جاتے ہیں اور

۲۔ نسخہ صحیح محشے گلستان سعدی شائع کردہ میاں عبدالرحمان و عبدالخالق تاجران کتب قصہ خوانی پشاور شہر (س ۔ ن) ص ۳۴۸ مکمل شعر یوں ہے ۔

شب تاریک دوستانِ خدا می تبابند چو روز رخشندہ
وین سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدای بخشندہ

اگر وہ کچھ سمجھتے بھی ہیں تو وہ حقیقت سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں[۳]

یہ انہی دقت طرازیوں کا نتیجہ ہے کہ آن کا کلام ہمیشہ معرض بحث میں رہا اور ایک عرصہ تک رہے گا۔ انھیں خود اس بات کی شکایت ہے کہ آن کے پیغام کے سننے والے بہت کم ہیں۔ بلکہ زمانہ حال کی فضا ہی ان کے لیے موافق نہیں۔ وہ ہر ذی ہوش مخترع فن کی طرح اپنے ہم عصروں سے بہت بلند نظر واقع ہوئے ہیں۔ آن کا پیغام ''شاعر فردا'' کا پیغام ہے۔ آن کے اسرار کو کماحقہ، سمجھنے کے لیے آئندہ نسلیں زیادہ موزوں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم من نوائے شاعر فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست[۴]

اور پھر اپنے ہم عصروں کی بے خروش زندگی، افسردہ اور جامد زندگی کا اپنی بے تاب طبیعت سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قلزم یاراں چو شبنم بے خروش شبنمِ من مثلِ یم طوفاں بدوش
نغمۂ من از جہانِ دیگر است ایں جرس را کاروانِ دیگر است[۵]

دنیا اکثر ایسے ذی ہوش اصحاب کمال سے بے اعتنائی کی مرتکب ہوتی رہی ہے اور اپنی کم فہمی کے باعث آن کے حیات افز پیغامات کو گوش غفلت سے سنتی رہی ہے۔ اگر دنیا کی آنکھیں کھلی ہیں تو ان ارباب کمال کی موت کے بعد جہاں لوگوں نے آن

۳۔ باقیاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی، ص ۱۴۲، شائع کردہ آئینۂ ادب چوک انارکلی لاہور طبع دوم ۱۹۶۶ء۔
۴۔ مثنوی اسرار و رموز، ص ۵۔
۵۔ ایضاً، ص ۷۔

کے نورانی جسموں کو نظر بھر کے دیکھنے کی پروا نہیں کی ۔ وہاں پھر اُن کی آرام گاہوں کی تیرہ خاک کی پرستش ہوئی ۔ وہ لوگ مرنے کے بعد زندہ ہوئے ۔ بڑے بڑے بلند پایہ شاعروں کا بھی یہ حال ہوا ۔ مرزا غالب کو دیکھئے ، اُن کے ہم عصروں کی بے التفاتیوں پر نظر ڈالیے ۔ اور پھر اُن کی موت کے بعد اُن کے بالغ نظر پرستاروں کی عبادت آمیز عقیدت مندیوں کا مشاہدہ کیجیے ۔ تو آپ پر یہ مثال روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی ۔ خود حضرت اقبال اسی مسئلہ کو یوں ادا کرتے ہیں !

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم بر خود بربست و چشمِ ما کشاد

رخت ناز از نیستی بیروں کشید
چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید[۶]

میرا موضوع اقبال کی شاعری ہے ۔ میں اس موضوع کے تین پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا :

۱۔ اقبال کا پیغام اور اس کی نوعیت ۔
۲۔ اقبال کا کلام با فن شاعری ۔
۳۔ اقبال کی شاعری کی حیثیت اور اس کا اثر ۔

اقبال کے پیغام کے متعلق میں کسی قدر اختصار سے کام لوں گا ۔

حضرت اقبال کا پیغام کیا ہے ؟ اُن کے خیالات و احساسات کی نوعیت کیا ہے ؟ اُن کے دل و دماغ کے خلوت کدوں میں کون سے اسرار مضمر ہیں ، جن کے اظہار کے لیے وہ بیتاب ہیں ۔ وہ کون سی آگ ہے جو شرر افشاں آہوں ، شعلہ ریز فریادوں اور برق پاش

۶۔ کلیات اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۷ ۔

نالوں کے باوجود ابھی تک اُن کے سینے میں فروزاں ہے۔ وہ نے نوازیاں ، وہ نغمہ سرائیاں کیا ہیں ، جن سے خود تڑپنے اور دوسروں کو تڑپانا چاہتے ہیں ؟

یہ پیغام ، راز حیات ہے ۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راز ، جسے انھوں نے برسوں کی دلسوزیوں ، جگر کاویوں اشک ریزیوں کے بعد سمجھا اور اب وہ دوسروں کو سمجھانے کے لیے بے تاب ہیں ۔ لیکن جہان میں ایک بھی محرم راز نہیں ملتا ۔ جس کے سامنے وہ اس حقیقت کا اظہار کر سکیں ۔ وہ اپنی اس بے چارگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچے ہیں :

تاب گفتار اگر ہست شناسائے نیست
وائے آن بندہ کہ در سینہ او رازے ہست[۷]

واقعی کس قدر بے بسی کا عالم ہے :

سخن تازہ زدم کس بہ سخن وانرسید
جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید[۸]

ایک اور جگہ اسی خیال کو ظاہر کیا ہے :

تو مرا ذوق بیاں دادی و گفتی کہ بگوے
ہست در سینۂ من آنچہ بکس نتواں گفت[۹]

خدا نے شاعر کو ذوق بیان تو عطا کر دیا لیکن اس کے رموز و اسرار کو سننے والا مفقود ہے ۔ اور اگر کوئی جرأت کرے تو کیونکر ، یہ رموز و اسرار تو شعلوں کا حکم رکھتے ہیں ۔ سوائے اہل دل کے کون ان کا متحمل ہو سکتا ہے :

۷۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ زبور عجم ، ص ۱۶ ۔
۸۔ ایضاً ، ص ۹۰ ۔
۹۔ ایضاً ، ص ۴۶ ۔

رمز عشق توبہ ارباب ہوس نتواں گفت
سخن از تاب و تب شعلہ بہ خس نتواں گفت[۱۰]

حضرت اقبال شاعر فردا ہیں ۔ وہ ان خا کیان افسردہ خاطر سے الگ تھلگ ایک نیا جہان بناتے ہیں ۔ جس کا آدم اول وہ خود ہی ہیں ۔ اور جہاں کوئی دوسرا آن کا ہمراز و دمساز نہیں ۔ فرماتے ہیں :

دریں مے خانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر[۱۱]

آنھوں نے کائنات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ وہ اسرار ہستی کو سمجھنے سے پہلے تجسس حقیقت کی مختلف منازل طے کر چکے ہیں ۔ اول اول جب ان کی آنکھ کھلتی ہے تو آن کی نظر ہندوستان کی تنگ وطنی فضا پر پڑتی ہے ۔ وہ وطن کے شیدائی کی حیثیت سے ہندوستان کے گیت گاتے ہیں ۔ کوہ ہمالہ کو وطن کا نگہبان سمجھتے ہوئے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں ۔ ابنائے وطن کی پست حالت پر نوحہ خوانی کرتے ہیں ۔ اور انھیں بیدار کرنے اور آن کی خوابیدہ روح جگانے کے لیے درد بھری فریاد کرتے ہیں ۔ ''نیا شوالہ'' ، ''قومی گیت'' اور ''تصویر درد'' اسی عہد کی واردات ہیں ۔

لیکن جستجوئے حق کی یہ پہلی منزل ہے ۔ جب آن کی نظر ملک ہندوستان کے تنگ دائرے سے نکل کر پر وسیع فضائے عالم پر پڑتی ہے تو وہ وطن جو کچھ عرصہ پہلے آن کا نصب العین تھا اپنی ہستی اس وسیع کائنات میں کھو دیتا ہے ۔ جہاں انسان کی حیثیت ہندوستانی ، ایرانی ، تورانی ، افریقی نہیں ، بلکہ اس معمورۂ

۱۰۔ کلیات اقبال ، حصہ زبور عجم ، ص ۴۶ ۔
۱۱۔ ایضاً ، ص ۴۳ ۔

عالم کی کثیر المقدار آبادی میں ایک ادنٰی فرد کی رہ جاتی ہے۔ وطنیت عالمگیر اخوت میں بدل جاتی ہے۔ لیکن آن کی تجسس کوش نظریں یہاں آ کر ہی نہیں رکتیں۔ وہ معمورۂ عالم کو کائنات کا ایک جزو خیال کرتے ہیں۔ جہاں انسانی ہستی ایک ذرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ حقیقت کائنات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کے راز کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ علوم فلسفہ سے استمداد کرتے ہیں اور علم و دانش سے اس عقدے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انھیں پتا چلتا ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی خرد افروزیاں اس حقیقت کو منکشف نہیں کر سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

قدح خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
بمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد[۱۲] !

دانایان فرنگ کائنات کو دیکھتے ہیں۔ فطرت کے گونا گوں مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قدرت کی زبردست طاقتوں سے مفید کام بھی لیتے ہیں ، لیکن اس کی نیرنگیوں کی حقیقت کو سمجھنا آن کے فہم سے بالا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک قلب تپاں ایک چشم بینا ، ایک خلیلی روح ، ایک کلیمی نظر کی ضرورت ہے۔ کیا خوب کہا ہے :

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ
جگر بحر شگافید و بہ سینا نرسید[۱۳]

بحر شگافی کے لیے تو آبدوز جہاز کام دے سکتے ہیں ، لیکن تجلی حق کے مشاہدہ کے لیے کلیم اللہ کی آنکھ درکار ہے۔

انسانی عقل اشیاء کی سطح تک رہتی ہے۔ باطن کی خبر لانے

۱۲۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ زبور عجم ص ۵۷۔
۱۳۔ ایضاً ، ص ۹۰۔

کے لیے روحانی بیداری ضروری ہے :

دل بیدار ندادند بہ دانائے فرنگ
ایں قدر ہست کہ چشم نگرانے دارد[۱۴]

علم و دانش کی یہ افسردہ روحانیت ، یہ ٹھوس مادیت ، حقیقت کائنات کے انکشاف کا جہاں تک تعلق ہے محض سطحیت کا حکم رکھتی ہے - ہمارا شاعر اپنے منازل جستجو کو روحانی بیداریوں کے سہارے طے کرتا ہے - یہ راستہ اگرچہ بہت دور دراز ہے ، لیکن عاشق صادق کے لیے عرصۂ یک گام سے بڑھ کے نہیں - اور اگر یہ شرح صدر ، یہ روحانی کشف ، یہ نور عشق حاصل ہو جائے تو دونوں جہان پر حاوی ہو جانا آسان ہے - یہ آسمان ، یہ ستارے ، یہ کہکشاں ، یہ مہر و ماہ واضح ہو کر نظر کے سامنے آ جاتے ہیں جبریل تو درکنار عرش الٰہی تک رسائی ہو سکتی ہے - ہمارا شاعر کہتا ہے :

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ[۱۵]

حضرت اقبال نے انسانی دلوں کی تڑپ ، سوز و گداز ، جستجو و تلاش حق اور پھر وادی عشق کے تمام منازل کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے - وہ جانتے ہیں کہ انسان میں یہ تڑپ فطری ہے - انسان اگرچہ خاک کا پتلا ہے ، لیکن اس کی روح اپنے مرکز کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے - یہ چیز ہے جو اسے جستجو پر مجبور کرتی ہے یہ چیز ہے جو اسے بیتاب رکھتی ہے - استفہامی رنگ میں فرماتے ہیں :

۱۴- کلیات اقبال ، حصہ زبور عجم ، ص ۹۱ -
۱۵- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۳۳۶ -

درون سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجا ست ؟
سبو زماست و لے بادہ در سبوز کجاست ؟

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کف خاکیم
بہ ذرہ ذرۂ ما درد جستجو زکجا ست ؟

نگاہ ما بگریبان کہکشاں افتد
جنونِ ما زکجا ؟ شور ہائے وہوز کجاست ؟[16]

وہ خود اسی سوز میں جلتے ہیں - یہی شراب عشق انھیں مسرور رکھتی ہے اور یہی جستجو انھیں سرگرم عمل ! وہ اسی نظر سے کائنات کے ہر ذرے کو دیکھتے ہیں - اور اسی بصیرت افروز روحانی بیداری سے دونوں جہاں کا مشاہدہ کرتے ہیں - جب یہ کیفیت طاری نہ ہو تو یہ آنکھیں ایک پرکاہ کے پڑ جانے سے بند ہو جاتی ہیں ، لیکن اسی روحانی بصیرت سے دونوں جہان کے جلوے نظروں میں سما جاتے ہیں - ارشاد ہوتا ہے :

می شود پردۂ چشمم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے[17]

پھر دوسروں کو بھی اسی شاہراہ حق پر گامزن ہونے کی تلقین فرماتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ یہ مساعی کبھی خالی نہیں جاتیں -

در طلب کوش و مدہ دامن امید زدست
دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے[18]

۱۶- کلیات اقبال ، حصہ زبور عجم ، ص ۵ -
۱۷ ، ۱۸- ایضاً ، ص ۲ -

وہ اپنی اس وسیع مشربی اور کشادہ دلی ، سوز قلب اور جوش حرارت کے باوجود بارگاہ ایزدی سے ہمیشہ اس تڑپ ، اس سوز اس روحانی بیدار کے متمنی ہوتے ہیں ۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ زندگی یہی شے ہے ۔ وہ اپنی اس جستجوئے حقیقت کا خاتمہ نہیں دیکھنا چاہتے ۔ وہ اس نصب العین کے حصول کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہنا چاہتے ہیں ، کیونکہ اُن کے نزدیک یہی باطنی ہنگامہ آرائی ، یہی کشمکش ''حیات'' ہے ۔ وہ نہ صرف خود زندہ رہنا چاہتے ہیں بلکہ اپنی گرم نوائیوں سے دوسروں کو بھی بیدار کرنا چاہتے ہیں ۔ اور اس کے لیے بھی اسی بارگاہ ایزدی سے التجا کرتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کام نہایت دشوار ہے ۔ مردہ قوم میں روح حیات پھونکنے کے لیے دم عیسٰی کی ضرورت ہے ۔ بلند ہمتی اور استقلال کی ضرورت ہے ۔ دیکھیے فرماتے :

یا رب درونِ سینۂ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

ایں بندہ را کہ بانفس دیگراں نزیست
یک آہ خانہ زاد ، مثالِ سحر بدہ

سلیم ، مرا بجوئے تنک مایہ سپیچ !
جولاں گہے بوادی کوہ و کمر بدہ

شاہین من بصید پلنگاں گزاشتی !
ہمت بلند و چنگلِ ازیں تیز تر بدہ

رقتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار
تیرے کہ نافگندہ فتد کار گر بدہ

خاکم بہ نور نغمۂ داؤد بر فروز
بر ذرۂ مرا پر و بال شرر بدہ[19]

۱۹۔ کلیات اقبال ، حصہ زبور عجم ، ص ۴ ۔

حضرت اقبال اپنی دور رس نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب جو آج نوع انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہو رہی ہے دنیا کے لیے مفید نہیں - وہ روحانیت کو افسردہ کرتی ہے - وہ مادیت کی طرف لے جاتی ہے - اس کا انحصار محض علم و دانش پر ہے - دانایانِ فرنگ کی آنکھیں روشن ہیں - لیکن دل بجھے ہوئے ہیں اور روحیں سو رہی ہیں - ان کے قلب سوز سے عاری ہیں - وہ دور حاضرہ کے علوم و فنون کی ترقی میں روحانیت کے زوال کو دیکھتے ہیں - یہ ترقی نہیں تباہی ہے - یورپ کی آزادی کی بلند آہنگیاں حقیقت میں غلامی کی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں - سائنس کی روز افزوں ترقی نسل انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں بلکہ تباہ کار آلاتِ حرب کی ساخت کے لیے ہیں - نئی تہذیب کی یہ خوش منظر ، عظیم الشان عمارت نہایت سست بنیاد ہے - اس کی تعمیر ہی میں بربادی مضمر ہے - حضرت اقبال ان تمام غیر محسوس اثرات کو دیکھتے ہیں اور ایشیا والوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس سے بچنے کی تلقین فرماتے ہیں - کون ہے جس نے علامہ موصوف کا وہ لاہوتی نغمہ نہیں سنا جس میں انھوں نے جنگ عظیم سے برسوں پہلے ''آئینہ امروز'' میں ''واقعات فردا'' کو مشاہدہ کیا تھا - وہ کہتے ہیں :

دیارِ مغرب کے رہنے والو ! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے !
کھرا جسے تم سمجھ رہے وہ اب زرِ کم عیار ہو گا !

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپائدار ہو گا[۲۰]

''شمع و شاعر'' میں لکھتے ہیں :

۲۰- کلیات اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۱۵۰ -

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی !

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی !

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!![۲۱]

یہ اشعار انقلابات زمانہ کی کیسی شوخ تصویریں ہیں - اردو زبان اور اس کے کم ظرف الفاظ اس سے زیادہ معانی کے کہاں متحمل ہو سکتے ہیں !

لیکن یہ تصویریں خاموش تصویریں ہیں - میں آپ کو زندہ دکھاتا ہوں جہاں الفاظ و معانی سرگوشیاں کرتے ہوئے تڑپتے ہوئے نظر آ رہے ہیں - جہاں شاعر کے الہامی اشعار دلوں میں خود بخود اترتے چلے جاتے ہیں جنھیں پڑھ کر آنکھیں بینائی حاصل کرتی ہیں اور روح عبرت -

یہ بھی مغرب کی تہذیب اور اس کی فریب کاریوں کا نقشہ ہے:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے !

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے![۲۲]

وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کار زاری ہے !

۲۱- کلیات اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۲۱۵ -
۲۲- ایضاً ، ص ۳۱۳ -

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے[۲۳]

وہ ''پیامِ مشرق'' میں ''نقش فرنگ'' کے عنوان کے تحت تہذیب مغرب پر اپنے خیالات کا اظہار اور بھی زیادہ موثر ، زیادہ بلیغ اور زیادہ فصیح انداز میں کرتے ہیں :

از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ
عقل تابال کشود است گرفتار تراست

برق را ایں بجگرمی زندآں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تراست

چشم جز رنگ گل ولالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تراست

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تراست

دانش اندوختہ دل زکف انداختہ
آہ ازاں نقد گرانمایہ کہ درباختہ[۲۴]

عقل و عشق کا کتنا زبردست مقابلہ کیا ہے - کس بلیغ پیرائے میں دونوں کے کارہائے نمایاں دکھائے ہیں - عقل جو ہر صاحبِ علم و دانش کی محبوبہ ہے ، جسے ہر تشنہ کام علم و تحقیق چشمۂ فیض جانتا ہے - مسیحائی تو کرتی ہے لیکن اس کی مسیحائی مردوں کو زندہ نہیں کرتی - افسردہ طبائع کو بیدار نہیں کرتی ، سوئی ہوئی روحیں نہیں جگاتی بلکہ انھیں اور بھی افسردہ کر دیتی ہے - وہ بیمار ہوں تو بیمار تر کر دیتی ہے -

---

۲۳- کلیات اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۳۱۳ -
۲۴- کلیاتِ اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۱۸۷ ، ۱۸۸ -

کیسا دلکش اندازِ بیان ہے - کیا موثر پیرایہ ہے - کیا کوئی شخص عقل کی افسردہ کار فسوں گری ، نا مسیحائی اس سے بہتر بیان کر سکتا - یقیناً یہی چند اشعار کی شہرتِ دوام کے لیے کافی ہیں -

کائنات کے ذرے ذرے کی شناخت اور واقعات عالم کی حقیقت کو جب سمجھتے اور جس طرح سمجھتے ہیں اُسے وہ اپنے لیے باعثِ فخر خیال کرتے ہیں - وہ اس پر نازاں ہیں - ارشاد ہوتا ہے :

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانۂ را کہ باغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برو مند و جواں می بینم
کوہ را مثل پر کاہ سبک می یابم
پرکا ہے صفتِ کوہ گراں می بینم
انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہر نغمہ زلرزیدن تارے بیند[۲۵]

دیکھیے وہ اپنی حقیقت شناس نظروں سے ہر ذرہ کے دل کو بیدار پاتے ہیں - وہ اس شباب کو جو عرف عام میں درخت کے نام سے مشہور ہے - دانہ کی صورت میں دیکھ کر ہی اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس میں کتنی دمیدگی ہے - اس کی بالیدگی کی حد کیا ہے - اس کے ایک ایک پتے کو گنتے اور ہر پھول کو سونگھتے اور ہر پھل سے سیر کام ہوتے ہیں -

---

۲۵- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۱۹۲ -

آئندہ واقعات کے رونما ہونے اور مختلف ارتقائی منازل طے کرنے کو کیسی نادر تشبیہوں اور کتابوں میں بیان کیا ہے ۔

دنیا میں ایک طرف عظیم الشان حکومت ہے اور اس کی باجبروت فوجیں ، دوسری طرف محکوم قوم کی محکومیت ہے اور اس کی بے چارگی اور مظلومیت ، لیکن حضرت اقبال نظیری کے اس نکتۂ راز سے واقف ہیں :

گو کہ ایں صف شکناں قصد ضعیفاں نکنند
کہ دریں قافلہ گاہے قدر اندازے ہست[۲۶]

وہ جانتے ہیں کہ ایقلاب زمانہ گردش روزگار نے بارہا ایسے کرشمے دکھائے ہیں کہ ایک بے دست و پا ، محکوم و مظلوم قوم نے اٹھ کر کوہ وقار سلطنتوں کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے ۔ وہ زیر دستوں کی اس طاقتِ غیبی اور زبردستوں کی اس سراب آسا سطوت کی حقیقت کو جانتے ہیں ۔ جبھی تو فرماتے ہیں :

کوہ را مثلِ پر کاہ سبک می یابم
پرکا ہے صفتِ کوہِ گراں می بینم[۲۷]

وہ اس چیز سے بھی بے خبر نہیں کہ دنیا ایسے انقلابات کو ہمیشہ استعجاب سے دیکھتی ہے ۔ آسمان انھیں حیرت سے تکتا ہے ۔ خود کارکنانِ قضاء و قدر کو تعجب ہوتا ہے ۔

انقلابے کہ نہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم[۲۸]

جاوید نامہ میں ، جو ان کی تازہ ترین تصنیف ہے ، جاوید سے

۲۶- کلیاتِ نظیری مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ (س - ن) ، ص ۳۸ -
۲۷ ، ۲۸- کلیاتِ اقبال ، حصہ پیام مشرق ص ۱۹۲ -

خطاب کرتے ہیں اور اسے مغربی تہذیب کے زیر اثر آئندہ رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دنیا محض عقل و دانش کی اسیر ہو کر رہ جائے گی ۔ دلوں میں سوز و گداز نہ ہوگا ۔ آنکھیں مجاز پرست ہو جائیں گی ۔ دنیا کے لوگ اصنام آب و گل کے پرستار ہو جائیں گے :

گر خدا سازد ترا صاحب نظر
روزگارے را کہ می آید نگر !
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز
چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز !
علم و فن ، دین و سیاست ، عقل و دل
زوج زوج اندر طوافِ آب و گل ![۲۹]

اس اثر سے ایشیا بھی نہ بچ سکے گا :

آسیا آں مرز و بوم آفتاب غیر بیں از خویشتن اندر حجاب !
قلب اوبے واردات نو بنو حاصلش را کس نگیرد با دو جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر ساکن و یخ بستہ، و بے ذوقِ سیر!

صید ملایان و نخچیرِ ملوک
آہوئے اندیشہ اولنگ و لوک ![۳۰]

ان حقائق و معارف میں اقبال کا فلسفۂ خودی بھی شامل ہے جس پر اس کی رائے میں ہر شے کی زندگی کا انحصار ہے ۔ خودی سے کائنات کے ہر ذرے کا وجود ہے ۔ خودی سے انسان کی ہستی قائم ہے ہاں تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ خودی کیا ہے ؟ اور اس کے لوازمات کیا ہیں ؟

---

۲۹ ، ۳۰- کلیاتِ اقبال حصہ جاوید نامہ ، ص ۲۰۱ -

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے لیے اپنی ہستی کا احساس ہی خودی ہے ۔ اس کے اپنے اندر کمالات کے تمام اسرار پوشیدہ ہیں جس قدر یہ احساس زیادہ تیز اور استوار ہوگا اسی قدر زندگی زیادہ استوار ہو گی ۔

اس حیات خودی کو قائم رکھنے کے لیے آرزوئے مسلسل کی حاجت ہے ۔ جس انسان کے دل میں کسی مدعا کے حصول کے لیے آرزوئیں ، تمنائیں بے تاب نہ ہوں ۔ اس کا وجود مشتِ خاک سے زیادہ نہیں ۔ اس کا جسم ایک مزار ہے ۔ انسانی قلب میں آرزوؤں کی یہی تڑپ اسے سرگرم عمل رکھتی ہے ۔ وہ محوِ جستجو رہتا ہے یہ جستجو ہی اس کی روح رواں ہے ۔ جسم اسی سے زندہ ہے ۔ دل اسی سے ہنگامہ آراء ہے ۔ روح اسی سے بیتاب و بیدار رہتی ہے ۔

دیکھیے ان سب کی شرح ''اسرار خودی'' میں اس طرح سے کی ہے :

زندگانی را بقا از مدعاست کار وانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل آو در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نگردد مشتِ خاک تو مزار[۳۱]

اور پھر کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں :

از تمنا رقص دل در سینہ ہا سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را خضر باشد موسیٰ ٔ ادراک را

آرزو ہنگامہ آرائے خودی
موج بیتابے ز دریائے خودی[۳۲]

---

۳۱ ، ۳۲- کلیاتِ اقبال حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۵ ، ۱۶ -

یہ خودی اُسی سوز عشق سے ، جس کو ہم پہلے بیان کر آئے ، سوز حاصل کرتی ہے - وہ خود نور ہے ، زندگی کا سوز و ساز ہے - محبت اس نور کو زیادہ روشن کرتی ، اس آگ کو اور بھی بھڑکاتی ہے - دل اس سے توانا ہوتے ہیں ، بیباک ہوتے ہیں اور روحانی ارتقاء کو حاصل کرتے ہیں -

نقطہ نورے کہ نام اُو خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر ، سو زندہ تر ، تابندہ تر

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصلِ عشق از آب و بادو خاک نیست

دل ز عشق اُو توانا میشود ! خاک ہمدوشِ ثریا میشود[۳۸]

یہ عشق ، عشقِ حق ہے - اس کے لیے کسی خارجی معشوق و محبوب کی ضرورت نہیں - وہ محبوب انسان ہی کے دل میں نہاں ہے ہاں اُسے دیکھنے کے لیے چشمِ بینا درکار ہے -

فرماتے ہیں :

عاشقی آموز و محبوبے طلب چشمِ نوحے، قلبِ ایوبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمع خود را ہمچو رومی بر فروز روم را در آتشِ تبریز سوز

ہست معشوقے نہاں اندردلت
چشم اگر داری بیا بنہائمت[۳۹]

---

۳۳ ، ۳۴- کلیاتِ اقبال حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۸ ، ۱۹ -

ایک عارف کی حقیقت شناس نظر اور قلبِ تپاں دونوں مل کر اس شاہد حقیقی کے جلوے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بے خودی کیا ہے؟ خودی جب تک انفرادی زندگی میں ہے، خودی ہے۔ لیکن جب ایک فرد جماعت میں شامل ہو جاتا ہے تو اُس کی حیثیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے ناز ہوتا ہے پھر نیاز۔ وہ پہلے اگر قطرہ ہوتا ہے تو پھر سمندر بن جاتا ہے۔ وہ اگر خودی کی حالت میں محض ایک برگ گل تھا تو اب وہ ایک چمن زار ہے۔ دیکھیے کس دلکش پیرایہ میں کہتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش رونقِ ہنگامہ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی[۳۵]

ان اشعار میں شاعر نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے فرق کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ فرد کی زندگی بغیر جماعت کس قدر محدود ہے۔ اس انسان کو جو ان حدود سے گزرنے کے لیے بے تاب ہو ''قطرۂ وسعت طلب'' کہنا کیسا پیارا انداز بیان ہے، بظاہر قطرے کا وسعت حاصل کرنا کتنا ناممکن ہے، لیکن قلزم بننا بھی کس قدر نمایاں ہے۔

کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے۔ پریشان افراد بکھری ہوئی پھولوں کی پتیاں ہیں۔ لیکن ایک جماعت میں شریک ہو کر وہی چمن بن جاتی ہیں۔

۳۵- کلیاتِ اقبال حصہ اسرار و رموز، ص ۸۶، ۸۸۔

حضرت اقبال کا مخاطب کون ہے ؟ آن کا مخاطب دنیا کا ہر فرد بشر ہے - ہر وہ شخص جو سینے میں ایک مضطرب دل ، ایک آرزو رکھتا ہو ، جو جستجوئے حقیقت میں سرگرم رہ کر اپنی زندگی کو حیاتِ تازہ بخشنے کا متمنی ہو ، آن کی مخاطب ہر وہ قوم ہے جو دنیا میں اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہے جو صحیح شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کی خواہش مند ہے لیکن وہ مسلمان ہیں ، ایشیائی سوز و گداز آن کی رگ و پے میں ہے - وہ عالمگیر اخوت کے ، جس کا دوسرا نام اسلام ہے ، علمبردار ہیں - وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ دنیا اور بالخصوص مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو آن کے لیے اسلاف کا ہی طرزِ عمل مفید ہے -

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر[۳۶]

اس اعتبار سے کہ اخوتِ اسلامیہ کی بحث نامکمل رہ جائے ، میں مثنوی اسرار سے چند اشعار اور رموز سے ایک حکایت نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں ، جس سے آپ کو نہ صرف شاعر کے صحیح تصورِ اخوت کا پتہ چلے گا ، بلکہ آس کے زور کلام اور اندازِ بیان کا بھی اندازہ ہو سکے گا - اس خیال کو کہ مسلمان ایک ہیں - اس طرح بیان فرماتے ہیں :

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما شبنم یک صبح خندانیم ما
مست چشمِ ساقیِ بطحا ستیم در جہاں مثلِ می و مینا ستیم
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتش آو ایں خس و خاشاک سوخت[۳۷]

۳۶- کلیاتِ اقبال حصہ بانگ درا ، ص ۲۶۵ -
۳۷- کلیاتِ اقبال حصہ اسرار و رموز ، ص ۲۰ -

رموز میں عربوں کے ایران پر حملہ آور ہونے کے وقت کا ایک واقعہ درج ہے - یزدجرد کے ایک سپہ سالار کو لڑائی میں ایک مسلمان اسیر کر لیتا ہے - وہ مکار سپہ سالار اپنی بلند شخصیت کو چھپاتا ہے اور معمولی سپاہی کی حیثیت میں اس سے "جاں بخشی" کرا لیتا ہے - جب جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایران کی سلطنت تباہ ہو جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جاپانی ہے - اس اسیر کو حجازی افواج کے سپہ سالار ابو عبیدہ کے حضور میں لاتے ہیں اور اس جھوٹ کے لیے قتل کی سزا دلانا چاہتے ہیں ، لیکن ابو عبیدہ جواب دیتے ہیں :

گفت اے یاراں مسلمانیم ما
تارِ چنگیم ویک آہنگیم ما
نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلق بلالؓ و قنبرؓ است
ہر یکے ازما امین ملت است
صلح و کینش صلح و کینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جان فرد
عہد ملت می شود پیمانِ فرد
گرچہ جاباں دشمنِ ما بودہ است
مسلمے أورا امان بخشودہ است
خونِ او اے معشرِ خیرؐ الانام
بردمِ تیغ مسلمانان حرام[۳۸]

یعنی فرد کا فیصلہ ملت کا فیصلہ ہے - اگر مسلمان کسی کی جاں بخشی کی ہامی بھرتا ہے ، تو قوم پر اس کا خوان حرام ہو جاتا ہے -

---

۳۸- کلیاتِ اقبال حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۰۶ -

اقبال کا فنِ شاعری

میں نے حضرت اقبال کے پیام یا اُن کے خیالات و احساسات پر بہت کچھ کہا ہے ۔ اب یہ دکھانا مقصود ہے کہ بحیثیت فن شاعری کے اُن کے کمالات کیا ہیں ؟ جہاں تک زبان کا تعلق ہے انھوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں ۔ اردو کلام کا مجموعہ ''بانگِ درا'' اور فارسی کی متعدد تصانیف اس امر کی کافی شہادتیں ہیں ۔ اُن کی شاعری کا آغاز اردو زبان سے ہوتا ہے ۔ اور اس میں دوسرے شاعروں کی طرح غزل سے ابتداء کرتے ہیں ۔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر حضرت داغ کے تلمیذ بنتے ہیں ۔ اور اس سے اصلاحیں لیتے ہیں ۔ مختلف بحروں میں طبع آزمائی کی جاتی ہے ۔ قافیوں اور ردیفوں کو چمکایا جاتا ہے ۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتا ۔ شاعر کی وسعت تخیل ''تنگنائے غزل'' میں نہیں سما سکتی ۔ وہ دوسری اصناف شاعری سے کام لیتا ہے ۔ لیکن علوے تخیل اُن سے بھی اُبھر اُبھر کر نکلتا ہے ۔ اردو زبان کی کم مایگی جواب دے جاتی ہے ۔ وہ فارسی میں شعر کہنے لگتے ہیں جو اُن کے لیے بے حد موزوں ہے ۔ وہ خود فرماتے ہیں :

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است　　طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت　　خامہ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام　　درِ خورد با فطرتِ اندیشہ ام

خُردہ بر مینا مگیر اے ہوش مند
دل بذوقِ خردۂ مینا بہ بند[۳۹]

کہتے ہیں کہ زبان پر جو بمنزلہ مینا ہے اعتراض نہ کر کہ اُردو کیوں نہیں ، فارسی کیوں ہے ۔ بلکہ تو اس مینا کی شراب کے ذوق سے سیراب ہو ۔

۳۹۔ کلیاتِ اقبال حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۱ ، ۱۲ ۔

انھوں نے جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں ، تقریباً تمام مشہور اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے - غزل ، رباعی ، قطعہ ، مثنوی مسدس ، سبھی لکھے ہیں اور ہر ایک میں کامیاب ہوئے ہیں - لیکن اُن کا کمال فن شاعری کی ان ظاہری رسوم و قیود سے بالاتر ہے اُن کے کمال کا انحصار علو تخیل پر ہے - شوخیِ بیان اور زورِ کلام پر ہے - الفاظ و تراکیب کی رنگینی اور چستی پر ہے -

اُن کا اندازِ بیان فلسفیانہ ہے - وہ ہر شے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں - طلوعِ صبح کا ذکر ہو یا شفق شام کا ، کوہسار کا منظر ہو یا سبزہ زار کا موسم ، بہار کا تذکرہ ہو یا خزاں کا ، کشمکش زیست کا سوال ہو یا فسردگی مرگ کا ، وہ انھیں دیکھتے ہیں اور اُن میں یکسر محو ہو کر حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں - اشیاء یا واقعات کی سطح تک رہنا اُن کے لیے ناممکن ہے - یہی باعث ہے کہ منظر کشی میں زیادہ کوشاں نہیں ہوتے - اُردو اور فارسی کی متعدد نظمیں اس قول کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں - ''بانگ درا'' میں موج دریا ، ستارہ ، بچہ اور شمع اور خود اُن کی والدہ کا مرثیہ جس میں سوز و الم کے مقابلے میں فلسفۂ غم زیادہ ہے - ایسی ہی مثالیں ہیں - لیکن اس فلسفیانہ اندازِ بیان سے اُن کے جوشِ بیان میں فرق نہیں پڑتا ، الفاظ کی سادگی اور عبارت کی سلاست میں فرق نہیں پڑتا بلکہ کلام کی شوکت اور اس کی دلآویزی اور بھی بڑھ جاتی ہے فلسفہ کا خشک موضوع رنگینی اختیار کر لیتا ہے - یہی شاعر کا کمال فن ہے - دیکھیے ایک نظم عنوان ہے ''پھول کا تحفہ عطا ہونے پر'' فرماتے ہیں :

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے

''الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے !
کلی سے رشک گل آفتاب مجھ کو کرے''!

تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے

اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہل نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر

کبھی یہ پھول ہم آغوش مدعا نہ ہوا
کسی کے دامنِ رنگیں سے آشنا نہ ہوا

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے[۴۰]

یہ اردو کلام کی مثال تھی - فارسی میں جہاں شاعر کا علوے تخیل کام کرتا ہے - وہاں اشعار تیر و نشتر بن جاتے ہیں - میں یہاں چند مثالیں پیش کرتا ہوں -

محض انس میں جہاں عاشق و معشوق باہم راز و نیاز میں مصروف ہوں - عاشق کے لبریز شوق الفاظ کس قدر فصیح و بلیغ ہوتے ہیں - وہ ایک حرف میں ہزار داستانیں بیان کر سکتا ہے بلکہ اس کا ایک آنسو ، ایک آہ لاکھوں آرزؤوں کی لفظی صورتوں سے زیادہ موثر ہوتا ہے - لیکن عاشق اپنی داستان کو مختصر نہیں کرنا چاہتا - وہ اس وصل کی لذت کا جس میں دنیا بھر کے سرور پنہاں ہیں لاکھوں جنتیں جلوہ فرما ہیں ، خاتمہ نہیں دیکھنا چاہتا - اس ذوق

۴۰- بانگِ درا ، ص ۱۷۱ - ۱۷۲ -

حضوری کے لیے داستان کو طویل کیے جاتا ہے - اس مضمون کو شاعر نے کس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے :

بحرفے مے تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را [۴۱]

انسانی ہستی کا یہیں خاتمہ نہیں ہو جاتا ، یہ موت محض عارضی انقطاع ہے - اس کے بعد انسان کو ابدی زندگی عطا ہونے والی ہے لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ اس موت کے بعد ہمیں ہمیشہ کے لیے سو جانا ہے اور یہ مرگ ، مرگِ دوام ہے تو بھی انسان کو اس فانی دنیا میں اپنی زندگی اس خوش اسلوبی سے گزارنی چاہیے کہ خدا بھی اس بات پر سخت نادم ہو کہ میں نے انسان کو جو اپنی ذاتی مساعی سے اس قدر ارتقاء حاصل کر سکتا ہے کیوں نہ موت کے بعد دوبار زندہ کرنے کا اہتمام کیا - ایسی عظیم الشان ہستی کو اتنی ترقیوں کے بعد یک لخت ہمیشہ کے لیے تباہ کر دینا نا انصافی ہے - اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے :

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد [۴۲]

دیکھیے کتنا بڑا مضمون ہے اور کس سادگی سے ادا کیا ہے - انسان کو سعی عمل اور اکتسابِ کمال کے لیے اس سے بڑھ کے اور کون سا درس ہو سکتا ہے -

علم و دانش انسانی ہستی کے ارتقاء کے لیے ضروری ہے ، لیکن وہ علم و دانش جس کے حصول سے انسانی قویٰ باطل ہو کر رہ جائیں ، بے سود ہے - جو علوم ایک جری سپاہی کو بزدلانہ تعطل

۴۱- کلیاتِ اقبال حصہ زبور عجم ، ص ۵۴ -

۴۲- ایضاً ، ص ۸۴ -

کی طرف لے جائیں ۔ وہ کس قدر خطرناک ہیں ، کس قدر مہلک ہیں ۔

ارشاد ہوتا ہے :

من آں علم و فراست با پرِ کا ہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را[۴۳]

دیکھیے مردِ غازی کے سپاہانہ جذبے کو ، جو سر تا سر عمل ہوتا ہے زندہ رکھنے کے لیے وہ کس قدر بیتاب ہیں ۔ تلقین عمل اُن کا خاص شیوہ ہے ۔ وہ لوگ جو دنیا میں من و سلویٰ کے متلاشی ہیں ۔ اپنی ذاتی سعی و کوشش سے کچھ حاصل نہیں کرنا چاہتے ۔ سرگرمیِ عمل کی لذت سے بے نصیب ہیں جن کو ورثے میں سب کچھ مل جائے ۔ انھیں جدوجہد کے عیشِ پنہاں کی کیا خبر ۔

کہتے ہیں :

پشیمان شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیشِ بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است[۴۴]

پتھر سے خود لعل نکال لانے میں جو مسرت انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ لعل کے ورثۃً لینے میں نہیں ۔ عالی حوصلہ وہ انسان ہے جو ایسی دولت کے حصول پر خوش نہ ہو بلکہ پشیمان ہو ۔

انسان کو چاہیے کہ وہ ہر لحظہ کائنات کے اسرار و حقائق پر غور کرے ۔ اس کی ہر نگاہ فطرت کی گہرائیوں تک پہنچنی چاہیے ، ورنہ یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے کیا فائدہ ۔

دیکھیے اس مضمون کو کیسے ادا کیا ہے :

۴۳- کلیاتِ اقبال حصہ زبور عجم ، ص ۱۰۴ ۔
۴۴- ایضاً ، ص ۱۲۹ ۔

اگر بہ سینۂ ایں کائنات در نروی
نگاہ را بہ تماشا گزاشتن ستم است[۴۵]

فرماتے ہیں کہ جو نگاہ کائنات کے سینے کو شگاف نہ کرے اس کا آنکھوں سے باہر آنا ہی بیکار ہے۔

جن لوگوں کی آنکھیں حقیقت کے لیے ترس رہی ہوں، جن کے دل حقائق کو سمجھنے کے لیے بیتاب ہوں، اُن کے احساسات کی کیا حالت ہوگی۔ جو شاعر ہمہ تن سوز و گداز ہو کر نغمہ آرائی کرتا ہے وہ بظاہر "بے نواز" ہے، لیکن اس ترنم نے کے لیے اسے معمولی سانس سے نہیں بلکہ دم شمشیر سے کام لینا پڑتا ہے فرماتے ہیں:

اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چہ دانی!
دمِ شمشیر اندر سینہ باید نے نواز را![۴۶]

شاعر کی نغمہ سازیاں آسان نہیں، یہ تلوار سے کھیلنا ہے۔ ایک شعر نغز کہنے کے لیے سیروں خونِ جگر پینا پڑتا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

خشک سیروں تنِ شاعر سے لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ ترکی صورت[۴۷]

ان چند اشعار سے آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ ہمارے شاعر کا تخیل کس قدر بلند ہے۔ اُس کا اندازِ بیان کس قدر پاکیزہ ہے۔

دقت مضامین کے باوجود سادگی الفاظ کتنی حیرت انگیز ہے۔

۴۵- کلیاتِ اقبال حصہ زبور عجم، ص ۸۸۔
۴۶- ایضاً، ص ۱۰۴۔

زبان کیسی پیاری ہے - اس میں کتنی روانی ، کتنا زور ، کتنا اثر ہے اسی کو معجز نگاری کہتے ہیں - اس کا نام نکتہ آفرینی ، اسی کا نام شاعری ہے - اسی اعجاز کاری نے تو گرامی مرحوم ایسے بلند پایہ شاعر کو بھی بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور کیا کہ :

در دیدۂ معنی نگہباں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت[۴۸]

حضرت اقبال کی فلسفیانہ متانت میں کبھی کبھی شاعرانہ شوخی بھی آ جاتی ہے - میں یہاں ایک غزل کے دو شعر پیش کرتا ہوں

دگر ز سادہ دلی ہائے یار ، نتواں گفت
نشستہ بر سرِ بالین من ز درماں گفت[۴۹]

معشوق کی سادگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ سادگی کیا ہوگی کہ اپنے مریض عشق کے بالیں پہ بیٹھا علاج کی تدبیریں کر رہا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ ان تمام دکھوں کا درمان تو وہ خود ہی ہے - ایسے سادہ لوح معشوق کی بے خبری کا رنج عاشق کو بیمار کر دے تو کر دے ورنہ اس کے موجود ہوتے ہوئے دکھ ، درد کہاں -

تمام شاعر واعظ ، مفتی اور شیخ سے الجھتے رہے ہیں - حضرت اقبال کو بھی آن سے واسطہ پڑتا ہے - وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں کا ذاتی تقدس تو اس قابل نہیں ہوتا کہ انھیں نجات دلا سکے - البتہ وہ رند مشرب لوگوں پر فتویٰ لگا کر سرمایۂ زہد و اتقا فراہم کر لیتے ہیں اور یہی آن کے سفر آخرت کے لیے زادِ راہ کا کام دیتا ہے -

---

۴۸- دیوانِ گرامی ، شائع کردہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور (س - ن) ص ۳۱ -
۴۹- کلیاتِ اقبال حصہ زبور عجم ، ص ۶۷ -

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ میں ''کافر شیوہ'' اس لیے ہو گیا ہوں کہ شیخِ شہر کو مجھے کافر کہہ کر مردِ باخدا ہونے کا موقع مل سکے۔

ازاں پیشِ بتاں رقصیدم و زنار بربستم
کہ شیخِ شہر مردِ باخدا گردد ز تکفیرم![۵۰]

حضرت اقبال کی پختگی کلام، زورِ بیان، نادر تشبیہات کو جو اُردو، فارسی شاعری کی روح رواں ہیں دیکھنا ہو تو اُن کی وہ نظمیں دیکھیے جو انھوں نے ایرانی شعراء کی تازہ بحروں کے انداز میں لکھی ہیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ اُن کے قلم میں کتنا زور ہے۔ ''کرمکِ شب تاب'' نظم دیکھئے:

یک ذرۂ بے مایہ متاعِ نفس اندوخت
شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت
واماندہ شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شد
از سوزِ حیات است کہ کارش ہمہ زر شد
وارائے نظر شد
پروانۂ بے تاب کہ ہر سو تگ و پُو کرد
بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ اُو کرد
ترک من و تُو کرد
یا اختر کے ماہ مبینے بکمینے نزدیک تر آمد بتماشائے زمینے
از چرخِ برینے

۵۰- کلیاتِ اقبال حصہ زبور عجم، ص ۱۰۱۔

یا ماہ تنک ضو کہ بیک جلوہ تمام است
ماہے کہ برومنتِ خورشید حرام است
آزادِ مقام است !۵۱

دیکھیے کیسی چبھتی ہوئی زندہ تشبیہیں ہیں ۔ جگنو کو کہتے ہیں کہ ایک پروانہ ہے ، جو شمع پر جل کر خود چھوٹی سی شمع بن گیا ۔ اس عاشق کا یہ وصال معشوق سے اس قدر ہے کہ ''من و تو'' میں تمیز نہیں رہی ۔ ''فصل بہار'' ، ''سرور انجم'' ، ''حدی'' ، ''قطرۂ آب'' ایسے ہی شاہکار ہیں ۔

بعض تنگ نظر کور ذوق لوگ آن کی اردو پر معترض ہوتے ہیں آن کے مشکل الفاظ ، جدید اور انوکھی تراکیب پر تنقید کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اردو زبان ان کے وسعتِ تخیل کی کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے ! وہ اگر نئے الفاظ وضع نہ کریں ، اگر نئی تراکیب نہ تراشیں تو زبان میں وسعتِ بیان کیسے پیدا ہو ۔ کیا نیا پیرایۂ بیان اختیار کرنا فصاحت و بلاغت کے منافی ہے کیا ان تمام جدت طرازیوں اور مشکل بیانیوں کے باوجود آن کے کلام کو لوگ نہیں سمجھتے ؟ اور ان پر سر نہیں دھنتے ؟ کیا فارسی کے علاوہ آن کی اکثر اردو نظمیں مثلاً ''ترانہ'' ، ''شکوہ'' ، شمع و شاعر'' ، ''خضرِ راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' بچے بچے کی زبان پر جاری نہیں ؟ کیا انَ کے تتبع میں ہندوستان کے اکثر نوجوان آغاز شاعری میں آن کا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے ؟ کیا آن کی تعلیمات کو ادبی اور سیاسی حلقوں میں بطور سند کے پیش نہیں کیا جاتا ؟ اگر ان سب کا جواب ہاں میں ہے تو پھر کیا یہ اعتراضات بے معنی نہیں ؟ اس وقت نوجوانوں کا ایک زبردست گروہ انھیں نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ایشیا کا بہترین شاعر مانتا ہے ۔ ایک شاعر

۵۱- کلیاتِ اقبال حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۰۶ ، ۱۰۷ ۔

کی خوش قسمتی اس سے بڑھ کے اور کیا ہوگی کہ اسے خلاف معمول اپنی زندگی ہی میں اپنے کلام کی شہرت و قبول کے دیکھنے کا موقع مل جائے۔ حضرت اقبال اپنی معجز نگاریوں کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے اور آئندہ نسلیں آن کے الہامی نغموں سے اکتساب سوز کرتی رہیں گی۔

مضمون بہت طویل ہو گیا ، لیکن ذوق ابھی تشنہ ہے۔ میں اس بحث کو ''جاوید نامہ'' کے آن چند اشعار کا خلاصہ جو انھوں نے ''خطاب بہ جاوید'' کے اخیر میں قلمبند کیے ہیں ، درج کیے بغیر ختم نہیں کرنا چاہتا۔ یہ اشعار مثنوی ''رموز'' کے ''عرض حال'' کے رقت انگیز انداز بیان کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ خطاب حقیقت میں محض جاوید سے نہیں بلکہ ہر نوجوان سے ہے جو زندگی کی شاہراہ میں گامزن ہونے والا ہے اور جسے صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے۔

> ''دنیا اس وقت مادیت میں گرفتار ہے۔ دل سو رہے ہیں اور روحیں خوابیدہ ہیں۔ مردِ حق کا وجود عنقا ہے لیکن تلاش اور ذوقِ طلب لابدی ہے۔ اگر ایسے مرد باخبر کی صحبت میسر نہ آئے تو اسلاف سا سوز و گداز پیدا کرنا چاہیے تاکہ دل مضبوط اور ایمان قوی رہیں ، جانیں بے تاب ہوں۔ اور روحیں رقص کریں۔''[۵۲]

اگر نوجوان اس بیداریِ روح سے فیض یاب ہو جائیں تو ہمارا شاعر اپنی کامیابی سے تسکینِ قلب حاصل کرے گا اور اس کی روح مرنے کے بعد انھیں دعائیں دے گی۔

۵۲- کلیاتِ اقبال (فارسی) دیکھیے صفحات ۷۸۷ - ۷۹۶ -

نظم مسجد قرطبہ*

(جو ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

''بال جبرئیل'' کا سرسری مطالعہ کرنے سے پڑھنے والے کا ذہن دو نظموں کی طرف فی الفور منتقل ہوتا ہے ۔ وہ دو نظمیں ''ساقی نامہ'' اور ''مسجد قرطبہ'' ہیں ۔ جو کئی ایک اعتبار سے اقبال کی اردو نظموں میں شاہکاروں کا درجہ رکھتی ہیں ۔ اور اردو ادب و شعر میں بے مثال ہیں ۔

موخرالذکر نظم میں مسجد قرطبہ کا عنوان وہی حیثیت رکھتا ہے جو اقبال کے کلام میں ''بلال'' ''کنار راوی'' یا ''موٹر'' ۔ شاعر نے اس نظم میں مسجد قرطبہ کی تاریخ بیان نہیں کی ۔ اس کے فنی اور تعمیری محاسن کا جائزہ نہیں لیا ۔ نظم ''صقلیہ'' کی طرح اس قدیم حجازی تہذیب پر آنسو نہیں بہائے ۔ یہ عنوان محض ایک مرکزی نقطہ ہے ۔ جس کے گرد شاعر نے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کی ہے ۔ ایک کنایہ ایک اشارہ ہے ۔جو اس کے شاعرانہ احساسات کی ترجمانی کا کام دے رہا ہے ۔

شاعر نے اس نظم میں بہت سے مختلف النوع اور ایک دوسرے سے متضاد عناصر کو جمع کر دیا ہے ۔ مثلاً وقت کی رو ، بندہ مومن آرٹ ، اندلس کی فضائے حسین ، عالم نو کے معرض وجود میں آنے کے امکانات وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن ان تمام عناصر کو اس طرح منسلک

---

* مطبوعہ روزنامہ امروز ، لاہور ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء ، ص ۱۳ ۔

کیا گیا ہے ۔ کہ ان میں باہمی مغائرت باقی نہیں رہتی ۔ وہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں ۔ شاعر نے ان میں ایک تسلسل پیدا کیا ہے یہ تسلسل منطقی نہیں بلکہ جذباتی ہے ۔ چنانچہ ساری نظم ایک مکمل جذباتی تجربہ ہے ۔ جس کے خط و خال کو شاعر کے ذہن نے ایک ہی تخیل ، ایک ہی جذبے کی گہرائیوں میں ڈوب کر سنوارا ہے ۔ جس طرح حباب و موج کے وجود کا الگ تصور آب دریا کی پنہائیوں اور گہرائیوں کے بغیر ذہن میں نہیں آتا ۔ اسی طرح اس نظم کے کسی ایک بند یا ایک شعر کا تصور ساری نظم کے بغیر نامکمل سارہ جاتا ہے اور کسی وسیع تر شعری پس منظر کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ اقبال کے شاعرانہ کمالات ''بانگِ درا'' میں موجود ہیں ۔ اس لیے کہ اُن نظموں میں مضمون کا تنوع ہے اور خیالات اور جذبات کی رنگا رنگی ہے ۔ شاعر ان نظموں میں انسانی زندگی کے مختلف النوع محرکات کو آکساتا اور بیدار کرتا ہے جو اس کی بعد کی نظموں میں مفقود ہے ۔ جہاں اس کی شاعری کا دائرہ محدود ہوتا چلا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ سمٹ سمٹا کر ایک نقطے پر رک جاتا ہے ۔ جسے اس کا پیام کہتے ہیں اور اس کے بعد اس کی شاعری اسی محور کے گرد گھومتی ہے ۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہو ۔ وہ ذرا اس نظم کا مطالعہ کریں ۔ اور دیکھیں کہ شاعر کس طرح ایک ہی مضراب سے سازِ حیات کے کتنے مختلف تاروں کو بیک وقت چھیڑتا چلا جاتا ہے اور اگرچہ ہر چوٹ سے ایک نئی آواز لرز اٹھتی ہے ۔ لیکن ان سب کا زیرو بم ایک ہی نغمے کی تعمیر کا ضروری جزو ہوتا ہے ۔

میں نے پہلے بھی ایک دفعہ کہا تھا ۔ کہ اقبال کی ابتدائی نظمیں اور بالِ جبرئیل ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں ۔ البتہ دونوں میں ابتدا اور انتہا کا فرق ہے ۔ شاعر کے قول کے مطابق ۔

احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوزو تب و تاب اول ، سوزو تب و تاب آخر ![1]

دونوں کی غایت ایک ہے ۔ فرق نوعیت احساسات کا نہیں شدت احساسات کا ہے ۔ نغمہ ایک ہے فرق ہے تو زیر وبم کا ''شکوہ'' ایک نادان بچے کا گریۂ معصوم ہے ۔ اور عجز و بے چارگی کا اظہار ، مسجد قرطبہ ایک کہن سال بزرگ کی فریاد اور جذبات کا جوش ظاہر ہے ۔ ایک بچے کی چیخ و پکار وہ اثر پیدا نہیں کر سکتی جو ایک بالغ انسان کی دبی ہوئی آہ اور اس کے خاموش آنسوؤں کی بے زبانی میں ہوتا ہے ۔

اقبال ایک فلسفی شاعر ہے اس کی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے دقیق اور خشک فلسفیانہ مسائل کو شعر بنا دیا ، یہ نظم اس کی بہترین مثال ہے ، اس نظم میں اس کا پیام اور کلام دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ وہ ایک مفکر بھی ہے اور شاعر بھی ، ایک پیغامبر بھی ہے اور فن کار بھی ، یہ دونوں خوبیاں ان کی کسی اور نظم میں بدرجہ اتم موجود نہیں ۔

اس نظم کی کامیابی کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ شاعر باوجود اپنی فکر کی انتہائی بلندیوں اور عمیق نکتہ طرازیوں کے ہمارے دل و دماغ کے بہت قریب آ جاتا ہے اور ہمیں نہ صرف اپنے ذہنی تصورات میں شریک کر لیتا ہے ، بلکہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار کر اپنے دلی کیفیات سے بھی متاثر کرتا ہے ۔

اقبال نے اپنی شاعری میں کوئی نیا عروضی تجربہ کرنے کی کوشش نہیں کی ، ان کی شاعری کا ڈھانچہ تقریباً تمام کا تمام قدیم طرز کا ہے ان کی نظموں کی بحریں ان کی اصناف کلاسیکی انداز کا پتہ

۱۔ بالِ جبریل ، ص ۷۷ ۔

دیتی ہے ، غزل ، مثنوی ، قطعہ ، مسمطات ، ترکیب بند یہ سب پرانے تیور ہیں ، زیر بحث نظم ساخت کے اعتبار سے ترکیب بند ہے اور چونکہ اس کے آٹھ بند ہیں ، اس لیے اسے ہفت بند کاشی کے مقابلے میں ہشت بند اقبال کہنا زیادہ موزوں ہوگا ۔ اقبال اگرچہ طرحیہ کلام کہنے کا عادی نہیں تاہم اس نے فارسی اور اردو کے ہر بڑے استاد کی کسی نہ کسی مشہور زمین میں شعر ضرور کہے ہیں ۔ کوئی بڑی بات نہیں ، کہ اس نظم کو لکھتے وقت محتشم کاشی کا مرثیہ اس کے پیش نظر ہو ۔

اقبال نے سہولت کی خاطر کہیں کہیں شعری تصرفات کیے ہیں مثلاً رباعی میں مخصوص بحر کو چھوڑ کر سادہ بحر ہزج مسدس اختیار کر لی ہے اور اس التزام کو اخیر تک قائم رکھا ہے ۔ اسی طرح قافیہ اور ردیف کو ترک کر کے جو خالص ایرانی ایجاد ہے ۔ عربی شاعری کے طرز پروری کو ترجیح دی ہے ۔ بالِ جبرئیل کے مجموعے میں یہ شعری عمل کثرت سے نظر آتا ہے ۔ مسجد قرطبہ کی ساری نظم بھی اسی التزام کے ماتحت لکھی گئی ہے ۔ آٹھوں بند ایک ہی طرز کے ہیں ۔ ہاں ہر بند کے بعد ٹیپ کا شعر قافیہ اور ردیف کا حامل ہے ۔

شاعر نے نظم کی ابتدا یوں کی ہے ۔

سلسلۂ روز و شب نقشِ گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ ووز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیرو بم ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برأت، موت ہے میری برأت

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو، جس میں نہ دن ہے نہ رات

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات، کار جہاں بے ثبات!

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا[۲]

نظم کے باقی بند بھی اسی طرح چلتے ہیں - مثلاً دوسرے بند کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام[۳]

اور تیسرے کا

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود[۴]

علیٰ ہذا القیاس باقی بندوں کے اشعار بھی اسی روی پر ختم ہوتے ہیں - روی کے التزام کے ساتھ ساتھ شاعر نے جو بحر اس نظم کے لیے منتخب کی ہے - وہ اگرچہ نئی نہیں تاہم اردو شاعری کے مروجہ اور متداول بحروں سے الگ تھلگ ضرور ہے - یہ انتخاب

۲، ۳- بالِ جبریل، صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷ -
۴- ایضاً، ص ۱۲۹ -

شاعر کا شعوری عمل نہیں - بلکہ ارادی اور اختیاری تصرف ہے - اس لیے کہ اس بحر کی رفتار ، خیالات کی ثقاہت ، اور جذبات کے شدید مگر منضبط اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہم آہنگ ہے - مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلات کے ارکان میں جو باہمی توازن ہے - اس کے اشعار میں ایک اندرونی ترنم پیدا ہو گیا ہے - جو قافیہ اور ردیف کے نہ ہونے کی تلافی کر رہا ہے - اور نظم کی مجموعی موسیقیت میں کمی واقع نہیں ہوتی - اس پر طرہ یہ کہ سب تصرفات ایسے سادہ اور قدرتی انداز میں کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا - یہ شاعر کے کمالِ فن کی دلیل ہے -

اقبال کے مداحوں نے اس کے پیام کو اس کے کلام کے شعری محاسن پر مسلط کر رکھا ہے - خود اس کے اپنے شعر بھی اس امر کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں -

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے![5]

نہ زباں کوئی غزل کی ، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی![6]

لیکن شاید اقبال سے زیادہ زبان سے باخبر اردو کا کوئی شاعر نہیں تھا اور ''دلکشا صدا'' کی حقیقت کو جسے عرفِ عام میں شعریت کہتے ہیں - وہ بخوبی جانتا تھا ، یہی وجہ ہے کہ جب اس نے ایک عرصے کے بعد فارسی شاعری کو چھوڑ کر اردو میں پھر شعر کہنے شروع کیے تو اردو زبان کی کم مائگی یک لخت دور ہو گئی - جس کی اسے ہمیشہ شکایت رہا کرتی تھی اور جس کا بہانہ کر کے وہ فارسی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا کرتا تھا اس

٥- بال جبریل ، ص ٧٢ -
٦- ایضاً ، ص ٢٧ -

لیے کہ شاعر کا ذہن خود کم مایہ نہیں تھا ، اور جب یہ بات نہ ہو تو عجمی ، تازی یا ہندی کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہتی ۔

اقبال کو زبان پر کہاں تک قدرت حاصل تھی یہ ایک الگ بحث ہے ۔ اس کے لیے ایک مستقل شعری اور لسانی تجزیے کی ضرورت ۔ سرِ دست اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس نے اگرچہ قدیم فارسی ترکیبوں ، تشبیہوں اور استعاروں کو کثرت سے استعمال کیا ہے ، لیکن ان کے معانی کا رجحان بالکل بدل دیا ہے ۔

''مسجد قرطبہ'' میں بعض ایسے عربی اردو فارسی کے ثقیل اور قدرے غیر مانوس الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جنہیں عام طور پر شاعرانہ زبان سے مغائرت ہے ۔

سلسلۂ روز و شب صیرِ فئ کائنات>
عشق ہے صہبائے خام ، عشق ہے کاس الکرام[٨]

اسی طرح امیر جنود ، ابن السبیل ، بادۂ رحیق ، ثغور اور تیغ اصیل ایسے الفاظ کی نشست شعروں میں اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ اردو زبان کے مانوس جزو معلوم ہوتے ہیں ۔ شاعر نے نہ صرف انھیں فنی طور پر اپنایا ہے ، بلکہ ان میں معنوی وسعت کے ساتھ ساتھ جذباتی وسعت بھی پیدا کی ہے ، ان الفاظ اور تراکیب کو شعری تصورات بنا کر انھیں حسین بنا دیا ہے اور ان سے مترنم آوازیں پیدا کر کے اپنی نظم کے نغمے کی تعمیر کی ہے ۔

اس نظم کی اہم اور نمایاں خصوصیت اس کا ''مترنم پن'' ہے ساری نظم ایک خاموش قافلے کی طرح چلی جاتی ہے جس کے ہر راہی

٧- بال جبریل ، ص ١٢٦ ۔
٨- ایضاً ، ص ١٢٨ ۔

کا قدم ایک ہی نہج پر پڑتا ہے اور جس کا ہر مسافر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے ، نظم میں مسلسل طور پر ایک جذباتی رفتار قائم رہتی ہے جس میں کہیں کوئی تیزی یا ہلکا پن پیدا نہیں ہوتا الفاظ کی اجنبیت یا ثقالت اس تسلسل میں حارج نہیں ہوتی - اس لیے کہ وہ الفاظ معنوی اشارے نہیں بلکہ احساساتی محرکات ہیں جن سے جذبات خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں -

اقبال جب اپنے غزل گو ہونے سے انکار کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ناسخ ، ذوق اور داغ کی شاعری ہوتی ہے جس میں محاورہ برائے محاورہ اور صنائع بدائع کے حربوں کا سہارا لیا جاتا ہے - اس نظم میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں ہوا - نظم میں کوئی لفظ ، کوئی ترکیب کوئی استعارہ کوئی لہجہ ایسا نہیں جس سے اس طرح کا مصنوعی کام لیا گیا ہو - نظم روایات کی سطح سے بلند رہتی ہے - شاعر نے لفظوں ، ترکیبوں اور بندشوں سے جذباتی پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے ، جس میں وہ بہت کامیاب ہوا ہے -

چند ایک شعر سنیئے :

کعبۂ اربابِ فن ! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں !

آہ وہ مردانِ حق ! وہ عربی شہسوار
حامل ''خلق عظیم'' صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں !

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خردِ راہ بیں

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں[9]

جیسا کہ میں نے مضمون کے شروع میں کہا تھا - ''مسجد قرطبہ'' کا عنوان محض ایک کنایے کا کام دیتا ہے - اس لیے اس نظم کو پڑھ کر ذہن کسی اور ہی گوشے کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس مسجد کے ساتھ ساتھ ایک اور مسجد فضا میں تعمیر ہوتی دکھائی دیتی ہے - جس کے ستون اور محرابیں سنگ وخشت کی نہیں جس کی تعمیر انسان کے غیر فانی احساسات کی بنیادوں پر استوار ہے اور جس پر زمانے کی تیز رو غالب نہیں آ سکتی - اسی لیے کہ

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام[10]

جسے دستبرد حوادث نہیں مٹا سکتی ، اس لیے کہ وہ ابدی اور غیر فانی حقائق پر قائم ہے -

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں ، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیمؑ و خلیلؑ[11]

۹- بال جبریل ، ص ۱۳۳ ، ۱۳۴ -
۱۰- ایضاً ، ص ۱۲۸ -
۱۱- ایضاً ، ص ۱۳۰ -

اس کی بنیادیں کسی خاص مقام سے وابستہ نہیں اس لیے کہ

اس کی زمیں بے حدود ، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل[١٢]

اس مسجد کی چار دیواری اور صحن میں لوگ نماز کے لیے نہیں بلکہ ایک خلاق فن کی بارگاہِ عظمت میں عقیدت و محبت کا ہدیہ پیش کرنے کے لیے داخل ہوتے ہیں ، یعنی شاعر کی بارگاہ ۔

١٢- بال جبریل ، ص ١٣١ ۔

اقبال کا ساقی نامہ*

اقبال کی طویل اردو نظموں میں سے اہم مسجدِ قرطبہ اور ساقی نامہ ہیں جو بال جبریل کے مجموعے میں شامل ہیں ، ان نظموں میں شاعر نے نہ صرف اپنے خیالات کی پختہ کاریوں کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ شعر کے فنی کمالات بھی دکھاتے ہیں ۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ پر ایک سرسری تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا[1] کہ یہ دونوں نظمیں کئی ایک اعتبار سے شاعر کی اردو نظموں میں شاہکاروں کا درجہ رکھتی ہیں اور اور اردو ادب و شعر میں بے مثال ہیں ان دونوں نظموں کے عنوان بظاہر نظموں کے نفسِ مضمون سے کوئی لفظی رابطہ نہیں رکھتے جس طرح مسجدِ قرطبہ میں شاعر نے اسلامی دور اقتدار کی عظیم الشان عمارتوں کی کوئی تاریخ بیان نہیں کی اور مسجد کے تعمیری محاسن کا تذکرہ نہیں کیا ، اسی طرح ساقی نامہ میں بھی قدیم روایتی باتوں سے گریز کیا ہے ۔ مسجدِ قرطبہ کی طرح ساقی نامہ بھی فی الحقیقت ایک فنی کنایہ ایک ادبی علامت ایک شاعرانہ اشارہ ہے جس کے گرد شاعر نے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کی ہے ۔

فارسی اور اردو شاعری میں ساقی نامے ایسی نظمیں ہوتی ہیں

---

* مطبوعہ روزنامہ 'امروز' لاہور ، ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء ، ص ۱۰ ۔

۱۔ اس سے مراد فاضل مصنف کا وہ مضمون ہے جو قرطبہ کے عنوان سے امروز لاہور کی ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں چھپا اور اب اس کتاب میں بھی شامل ہے ۔

جس میں شاعر شراب و مہ خانے کا ذکر کرتے ہوئے نشاط و طرب کی فضا پیدا کرتا ہے اور دنیا کے آلام و زندگی کی تھکن کو بھول جانے کی کوشش کرتا ہے یہ ذکر شراب و بہار محض ایک ذہنی گریز ایک فرار ہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی یہ شراب شراب معرفت بھی بن جاتی ہے اور اس شراب کا سرور سرورِ سرمدی کی سی کیفیت رکھتا ہے لیکن فارسی اور اردو کے بیشتر ساقی نامے دراصل دوسری نظموں کی طرح محض روایتی شے بن کر رہ جاتے ہیں اقبال نامہ بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے ۔ قدیم ساقی ناموں اور اقبال کے ساقی نامے میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے اور وہ عنوان نظم ہے اگرچہ شاعر ساقی نامے کی سی فضا پیدا کرتا ہے اور اس کے تمام لوازمات سے ہمیں روشناس کراتا ہے تاہم ہمیں ایک اور ہی دنیا نظر آتی ہے ۔

اقبال کی نظم 'ساقی نامہ' موضوع کے اعتبار سے مسجد قرطبہ کی ہم سخن ہے لیکن ہم نوا نہیں ، یعنی دونوں نظموں کا نفس مضمون ایک ہے لیکن دونوں کی لے مختلف ہے اور ان کی لے میں وہی فرق ہے جو خود ان نظموں کے عنوانوں میں ہے ۔ ایک طرف ایک نظم کا عنوان تاریخ تقدیس اور فنون کا پس منظر پیش کرتا ہے تو دوسری طرف دوسرا عنوان خرابات طرب و انبساط کا پہلو لیے ہوئے ہے ۔ شاعر کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس طرب و انبساط کی فضا میں وہ اپنے دقیق اور متین خیالات کو اس طرح سموتا ہے کہ نظم کے نفسِ مضمون اور زبان و بیان میں مغائرت باقی نہیں رہتی ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے شاعر نے بہت سے وسائل اختیار کیے ہیں ۔

سب سے پہلے شاعر نے اس نظم میں ہلکی پھلکی بحر استعمال کی ہے جو بحرِ متقارب ہے اور پھر ساقی نامے کے لیے دیگر اصناف کے مقابلے میں مثنوی کا انتخاب کیا ہے حالانکہ 'پیام مشرق' فارسی ساقی نامہ میں اس التزام کو محلوظ نہیں رکھا ۔ وہاں ساقی نامہ

قصیدہ یا غزل کی ہیئت اختیار کیے ہوئے ہے - مثنوی کی ہیئت سے اسلوبِ بیان کی سادگی بدستور قائم رہتی ہے اور کہیں ثقالت پیدا نہیں ہوتی - مثنوی کی صورت میں ایک قباحت یہ ہوتی ہے کہ اشعار میں خود بخود یکسانیت سی آ جاتی ہے اس یکسانیت کو دور کرنے کے لیے شاعر نے روی کے ساتھ ساتھ مستقل قافیہ اور ردیف کے استعمال کے لیے اشعار ہمیں اس نظم میں ملے جلے جا بجا نظر آتے ہیں اس سے نظم میں موزوں آتار چڑھاؤ پیدا ہو گیا ہے جس سے اس کی موسیقیت برقرار رہتی ہے -

ہوا خیمہ زن کاروان بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار !
گل و نرگس و سوسن و نسترن ! شہید ازل لالہ خونین کفن !
جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں !

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب !
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا ، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا[٢]

آپ نے دیکھا کہ ان اشعار میں روی اور باقاعدہ ردیف کے متبادل تکرار سے نظم کے نشیب و فراز کی برجستگی بحال رہی ہے اس آتار چڑھاؤ سے ساقی نامے کی شعری کیفیت کو اپنی سطح سے کہیں نیچے نہیں آنے دیا - زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ اس نظم میں اختصار و ایجاز سے بھی بہت کام لیا گیا ہے - ایک چھوٹی سی

٢- بال جبریل ص ١٦٦ ، ١٦٨ -

نظم میں شاعر نے مسلمانوں کی ذہنی تاریخ ان کے روحانی ارتقاء ان کے انحطاط کے اسباب و علل ۔ اپنا فلسفۂ حیات ، اس فلسفۂ حیات سے قوم و ملت کا انحراف زمانے کے موجودہ مختلف اقوام عالم کی میدانِ جنگ میں تگ و دو اور پھر صلائے عمل یہ سب کچھ بھر دیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے طویل اور اہم مضمون کے ادا کرنے کے لیے انتہائی اختصار کی ضرورت ہے اس لیے آپ اس نظم میں بڑے بڑے معانی چھوٹے چھوٹے شعروں میں سموئے ہوئے دیکھیں گے جیسے دریا کوزے میں سمایا ہوا ہو ۔ شاید اس سے زیادہ اختصار ہمیں اقبال کے کلام میں اور کہیں نظر نہ آئے اس اختصار کی چند مثالیں دیکھئے ۔

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں[۳]

مسلمانوں کی ذہنی کیفیت ۔

تمدن ، تصوف ، شریعت کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام![۴]

موجودہ سیاست کی فسوں کاری اور اور پھر اس طلسم کے ٹوٹنے کو یوں طشت از بام کیا ہے ۔

گیا دور سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا![۵]

خود شاعر اپنے ذہن کی تصویر یوں کھینچتا ہے ۔

مری فطرت آئینہ روزگار! غزالانِ افکار کا مرغزار![۶]

زندگی کی کیفیت اور اس کی وسعتوں کو ایک شعر میں یوں بیان کر رہا ہے ۔

۳- بال جبریل ، ص ۱۶۶ ۔
۴ ، ۵- ایضاً ، ص ۱۶۷ ۔
۶- ایضاً ، ص ۱۶۹ ۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے!
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے![۷]

خودی کی پہنائیوں کو یوں واضح کیا ہے۔

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے!
نہ حد، اس کے پیچھے نہ حد سامنے![۸]

ان چند شعروں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس ایک نظم میں شاعر کتنے مختلف النوع مضامین کو زیر بحث لایا ہے اور پھر ان مضامین کے بظاہر متناقص عناعر کو کس طرح ایک سلسلے میں منسلک کیا ہے۔

چھوٹے چھوٹے شعروں میں بڑے مضمون کو بیان کرنا مشکل تھا۔ ایسے موقع پر اکثر مضمون کو بہت سے شعروں پر پھیلا دیا کرتے ہیں، ایسے اشعار کو جو ایک ہی مضمون پر حاوی ہوں قطعہ بند اشعار کہلاتے ہیں لیکن شعروں کا یہ ارتباط بالعموم مصنوعی ہوتا ہے اقبال کے یہاں یہ مصنوعی ارتباط مفقود ہے۔ ساقی نامے کا ہر شعر الگ تھلگ ایک نظم ہے اپنے میں مکمل جیسے غزل کے شعر ہوتے ہیں، لیکن یہ اشعار اپنی اندرونی تکمیل کے باوجود ایک دوسرے کے سہارے کھڑے نظر آتے ہیں ان اشعار میں نہ صرف ایک جذباتی تسلسل پایا جاتا ہے بلکہ ایک منطقی ربط بھی ہے۔ گویا ہر آنے والا شعر گزرے ہوئے شعر کا ایک لازمی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساری نظم ایک ہی کیفیاتی تجربہ ہے ایک ایسا تجربہ جو شاعر کے ذہن میں باقاعدہ ظہور میں آتا ہے۔ نشوونما پاتا ہے اور پھر ارتقائی مرحلے طے کرتا ہوا انتہائی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

۷- بال جبریل، ص ۱۷۱۔
۸- ایضاً، ص ۱۷۲۔

آؤ ذرا اس تجربے کی وسعتوں پر غور کریں - وہ وسعتیں جو اس نظم کا پس منظر ہیں ساقی نامے کا آغاز حسبِ معمول بہار سے ہوتا ہے اور اس کی تکمیل اس جامع مصرعے سے ہوتی ہے -

ع لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں[۹]

یہاں سے آگے شاعر اس زندگی کی لہر کو جوئے آب سے پیوست کرتا ہے جو خود زندگی کا ایک رواں دواں مرقع ہے -

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی ، لچکتی ، سرکتی ہوئی

اچھلتی ، پھسلتی ، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ!
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ!

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام!

پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز!

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات!
وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات![۱۰]

یہاں سے شاعر ہمیں مختلف راہوں سے اپنی منزل کی طرف لے جاتا ہے - زیست کا انداز ہر لحظہ بدلتا ہے - دنیا میں انقلابات آتے رہتے ہیں اقوام کی قسمتیں کروٹیں بدلتی ہیں ، گرتی اور ابھرتی ہیں ملت اسلام بھی کبھی عروج پر تھی مگر یہ -

---

۹ ، ۱۰- بال جبریل ، ص ۱۶۶ -

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی"

اس کی وجہ لذت شوق سے بدنصیبی ہے دلوں میں یہ آگ افسردہ ہو کر رہ گئی ہے شاعر ساقی سے خطاب کرکے پھر اسی شراب کہن کے لانے کو کہتا ہے جو زندگی کی رگوں میں تازہ روح بھر دیتی ہے۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے[۱۲]

پھر شاعر زندگی کی حقیقت بیان کرتا ہے جو ایک تیز رفتار سمندر کی طرح رواں دواں ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی[۱۳]

اس مسلسل تگ و دو میں وہی ہستیاں سلامت رہتی ہیں جو استوار و محکم ہوں جن کے کردار مستحکم ہوں جن کی خودی کسی مرحلہ پر بھی اپنی سطح سے نیچے نہیں آتی خودی کو برقرار رکھنے والی کون سی چیزیں ہیں۔

۱۱- بال جبریل، ص ۱۶۷۔
۱۲- ایضاً، ص ۱۶۹۔
۱۳- ایضاً، ص ۱۷۱۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند[۱۴]

جو لوگ اس دنیا کو اس عالم خورد و نوش کو منتہا سمجھ لیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اس لیے یہ تو ارتقائی خودی میں اولیں قدم ہے ۔

یہ عالم ، یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں[۱۵]

یہ ہے ساقی نامہ کا مختصر سا جائزہ ۔ شاعر ہمیں ان تمام پُر پیچ راستوں سے گذارتا ہوا چلا جاتا ہے اور اس سیر گردش میں ہمارا ذہن راہ کے نشیب و فراز سے کہیں نہیں گبھراتا ہم یوں محسوس کرتے ہیں گویا ایک ہی ہموار راستے میں پُر سکون انداز میں گامزن ہیں ۔

اس نظم میں ردیف وروی کے علاوہ شاعر نے اشعار کی اندرونی لے کے تسلسل کو بھی کہیں ٹوٹنے نہیں دیا اور باوجود اس کے کہ نفس مضمون جگہ جگہ پہلو بدلتا گیا ہے نظم کی کیفیاتی ہم آہنگی میں کہیں فرق نہیں آیا ۔

اس نظم میں شاعر نے ایسے الفاظ ، تشبیہات تلمیحات اور دیگر علامات استعمال کیے ہیں جو اس موضوع کے لیے موزوں ہیں وہ اس میں اس طرح کھپ گئے ہیں جس طرح زیور کی مناسبت سے

۱۴- بال جبریل ، ص ۱۷۳ ۔
۱۵- ایضاً ، ص ۱۳۷ ، ۱۷۴ ۔

موزوں نگینے ٹک جاتے ہیں وہ سب نظم کے طریبہ انداز کے مطابق ہیں چند الفاظ ملاحظہ ہوں کاروان بہار ، دامن کہسار ، آشیاں ، طیور ، ساقی لالہ فام ، گراں خواب ، بتان عجم ، لذت عشق ، جام و گردش ، نالہ نیم شب ، خلوت و انجمن ، غزالان افکار و مرغزار ، انجمن آفرین ، خلوت نشیں وغیرہ۔

اقبال نے اس نظم میں فارسی اور ہندی الفاظ میں بڑا حسین امتزاج پیدا کیا ہے یہ آمیزش ہمیں حسرت موہانی کی غزلوں میں نظر آتی ہے دو ایک مثالیں دیکھیے ۔

گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل
خوش آئی اسے محنت آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی!
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے ، کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں ، بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانہ شش جہات !
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات !
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت ، حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے !
ہوا جب اسے سامنا موت کا
کھٹن تھا بڑا تھامنا موت کا[۱۶]

۱۶- بال جبریل ، ص ۱۷۱ ، ۱۷۲ -

اردو ادب میں اقبال کی شاعری کا حصہ*

اقبال کے فلسفیانہ خیالات و افکار میں اتنی یک جہتی ، شوکت اور عظمت پائی جاتی ہے کہ ہم بسا اوقات اُن کے شاعرانہ کمالات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اُن کے افکار میں تنومندی اور دل پسندی کے جو عناصر ہیں ، وہ بیشتر اُن کی شاعری ہی کے ممنون احسان ہیں کتنے لوگ ہیں جنھوں نے ان کی تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کو اسی ذوق و شوق سے پڑھا ہے جس ذوق وشوق سے وہ ان کے اردو یا فارسی کلام کو پڑھتے ہیں اور لذت اندوز ہوتے ہیں ۔

اس مختصر سی صحبت میں اقبال کی اردو شاعری کا کوئی تنقیدی جائزہ لینا مقصود نہیں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کی توجہ ان چند امور کی طرف منعطف کراؤں جو ہمارے ادبی ارتقا کے نہایت اہم مسائل ہیں اور جن میں اقبال کی شاعری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔

جدید اُردو شاعری کا آغاز ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد شروع ہوتا ہے ۔ حالی ، آزاد اور ان کے رفقائے کار کو سب سے پہلے اپنی زبان اور بالخصوص اپنے ادب کی بے مائگی اور بے بضاعتی کا احساس ہوا اور اسی احساس کے ماتحت انھوں نے اعلان کیا کہ ہماری شاعری زندگی سے عاری ہے ۔ ہم اپنے ماحول سے نا آشنا ہیں ،

---

* مشمولہ 'تقاریر یوم اقبال' یکے از مطبوعات بزم اقبال لاہور ، اپریل ۱۹۵۴ء ، صفحات ۴۳ - ۵۶ ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غلط خیال آرائیوں سے نکل کر گرد و پیش پر نظر ڈالیں ، حقائق کو دیکھیں اور اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار میں زندگی کے مختلف النوع واقعات اور اس کے تمام دشوار گزار مرحلوں کا جائزہ لیں ، تاکہ ہماری شاعری اور ادب معاشرتی اور سیاسی طاقتوں اور قوتوں کا آئینہ بن جائے۔

لیکن حالی اور آزاد اور ان کے رفیقوں کی یہ کوششیں زیادہ تر قومی اصلاح پر مرکوز رہیں ۔ شاعری کی اصلاح در اصل محض ضمنی تھی ۔ اس لیے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اصلاحی شاعری کے پیش کیے ہوئے نمونے ان کے صحیح اور صحت مند احساس کا ساتھ نہ دے سکے ۔ میں مولانا حالی کے تنقیدی جائزوں کو ہمیشہ ان کی جدید شاعری پر ترجیح دیتا ہوں ۔

ہمارا قدیم ادب اور بالخصوص شاعری ، مدت تک ایک خاص طبقے کی میراث بنی رہی اور اسی طبقے کے خیالات اور احساسات کی ترجمانی کرنا اس کا کام تھا ۔ ہماری شاعری اسی طبقے کے لیے نغمۂ شادی اور نوحۂ غم کا سامان مہیا کرتی تھی ۔

بقول پروفیسر آل احمد سرور ''ہمارے شاعر یا تو دربار سے وابستہ تھے یا خانقاہ سے ، کبھی کبھی دونوں میں آنکھ مچولی ہو جاتی تھی ، اسی وجہ سے اس میں یا تو جوانی کے چونچلے اور ساز عشرت کے نغمے ہوتے تھے یا پھر روحانیت اور بے ثباتیٔ دنیا کے مضامین ۔ جو جھونپڑوں میں رہتے تھے وہ ہمیشہ محلوں کے خواب دیکھتے رہتے ۔ انھیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ جھونپڑوں میں محل سے زیادہ سکون اور آزادی میسر آ سکتی ہے ۔ اسی وجہ سے انداز بیان ایسا ہوتا تھا جسے محل والے پسند کرتے یا کر سکتے تھے ۔''

اُنیسویں صدی کے اواخر میں شعرا نے شاعری کو شخصی اور صنعتی دائروں سے نکال کر زندگی کے ایک وسیع میدان میں لا کر

رکھ دیا اور اسے زندگی کے حقائق کے قریب تر کرنے کی کوشش کرنے لگے ۔ انھوں نے فن کو سنوارنے کی بجائے زندگی کو سنوارنا چاہا ۔ یہیں سے اقبال کے شاعرانہ اجتہادات کا سراغ ملتا ہے :

جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں کہا کہ ہماری جدید شاعری کے پیشرو مخلص اور راست رو تھے ۔ ان کی ادبی کوششیں قطعی طور پر انقلابی نہیں تھیں ، البتہ ان میں اجتہاد کا رنگ ضرور تھا ، لیکن ان کے اجتہادی تصورات بڑے سادہ ، دھندلے اور غیر واضع تھے ۔ اقبال نے اپنی شاعری سے ان تصورات کو واضع اور متعین کر دیا ۔

اقبال کی شاعری اُردو ادب و شعر کی ''قومی تحریکات'' کے سلسلے میں ایک اہم کڑی ہے ۔ اس میں ہمیں قوم اور وطن کے صحیح تصور کا پتہ چلتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی قومی شاعری میں تین بڑے دور ہیں ۔ پہلا دور وطنیت کا دور ہے ، دوسرا ہمہ وطنیت اور تیسرا عالم انسانیت کا دور ہے ۔ شاعر وطن کے محدود دائرے سے نکل کر وسیع دنیا پر نظر ڈالتا ہے ۔ اس منزل میں عالمگیر اخوت اسلامی کا مقام بھی آتا ہے ، مگر وہ آگے بڑھ جاتا ہے ۔ اس نے دل میں عالمگیر مساوات انسانی کا جذبۂ کارفرما نظر آتا ہے ۔ اقبال پہلے روئے زمین کے مسلمانوں کو خطاب کرتا ہے پھر عام بنی نوع انسان سے مخاطب ہوتا دکھائی دیتا ہے ۔ یہ مقام اس کی شاعری کی آخری کڑی ہے ۔

دور حاضر کا ایک نقاد بیسویں صدی کے آغاز میں ادبی ڈانواں ڈول حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> ''اس عالم انتظار میں اقبال کو فطرت منظر عام پر لاتی ہے ۔ آغاز میں وہ مختلف راستوں سے گمزن ہوتے ہیں ، لیکن وہ بہت جلد ایک راہ منتخب کر لیتے ہیں ۔ اس کا نام اسلام ہے ۔ حالی ، شبلی اور اکبر نے یہی راستہ

انتخاب کیا تھا اور کچھ آگے بھی بڑھے تھے ، لیکن اقبال بہت جلد سبھوں سے آگے نکل گیا اور اس کی وسعت میں اضافہ کیا ۔ اسے فراغ اور کشادہ بنایا اور اس قدر کاوش کی کہ یہ راہ گویا ان کی ملک ہو گئی ۔ شروع ہی سے انھیں غیر شعوری طور پر اس راہ کی تلاش تھی ان کا دل اس کے لیے بے چین تھا ، اقبال کی رگ رگ میں اسلامی خون موجزن تھا ۔ ان کا حساس دل مسلمانوں کے تنزل کا نقشہ دیکھ کر بے چین ہو گیا ۔ حالی نے مادی تنزل پر زور دیا تھا ، شبلی اور اکبر نے تنزل کا حقیقی سبب مسلمانوں کی اسلام سے گمراہی کو قرار دیا ۔ اقبال نے بھی یہی زاویۂ نظر اختیار کیا ، لیکن ان کا مطمع نظر بہت وسیع تھا ۔ ان کی آنکھیں ہندوستان کے حدود ہی کے اندر نگراں نہ تھیں ، بلکہ کل انسانی دنیا کی خصوصاً نظارہ کناں تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال کا مطمح نظر ہی وسیع نہ تھا ، ان کا دماغ بھی بلند پایہ تھا ، اس لیے انھوں نے بلند و عمیق خیالات کو داخل کر کے قومی اور ملی شاعری کی فضا ہی بدل دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو اثر اقبال نے عصر حاضر خصوصاً نوجوان طبقے کے دل و دماغ پر ثبت کیا ، وہ ایسا دیرپا ہے کہ کبھی مٹ نہیں سکتا ۔ موجودہ عصر کا مؤرخ مسلمانوں کی بیداری کا ایک اہم ترین سبب اقبال اور ان کی نظموں کو قرار دے گا ۔ اقبال نے ملت کی ایسی گراں قدر خدمت کی جس کی نظیر مشکل سے ملے گی ۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال اردو میں بہترین قومی اور ملی شاعر ہیں ۔"

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے بنی نوع انسان کو ایک

روحانی انقلاب کا پیغام ایک مسلسل ، مربوط اور مکمل نظام پر مبنی ہے ۔ وہ اپنے خیالات اور افکار کو اخلاص ، پختہ یقین اور جوش اور سوز سے بیان کرتا ہے ۔ اقبال کے افکار کا یہ تسلسل ، یہ ربط و ضبط اس کی شاعری کو ایک خاص سمت کی طرف لے جاتا ہے اور اس میں ایک متعین رجحان اور یک جہتی پیدا کرتا ہے جس سے ہماری شاعری عاری تھی ۔ اردو ادب کو ایک مفید کار آمد راہ پر لگانا اقبال کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے ۔

لیکن ''یک جہتی'' اور ''متعین مقصد'' ہی پر بات ختم نہیں ہو جاتی ۔ اقبال کے غیر فانی ہونے کی ایک ٹھوس دلیل یہ بھی ہے کہ اس نے محض ذہنی طور پر نہیں ، تخلیقی اور عملی طور پر محسوس کیا اور ثابت کر دیا کہ شاعری اور زندگی لازم و ملزوم چیزیں ہیں ادب کا قدم زندگی کی حرکت کے ساتھ اٹھنا چاہیے ۔ جو ادب اس حرکت کا ساتھ نہیں دیتا ہے ، وہ مٹ جاتا ہے ۔ بقول تاثیر مرحوم کے ''اقبال کی شاعری ہنگامی نہیں ، وہ وقت کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور جو آج زندہ ہے ، وہ کل بھی زندہ رہے گی ۔''

ہاں تو اقبال کی شاعری خود زندہ نہیں ، اس نے ہمارے ادب کو بھی ایک نئی زندگی عطا کی ہے ایسی زندگی جو پائدار ہے اور غیر فانی ہے ۔

اقبال کی شاعری کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے فقط زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی سے وابستہ ہی نہیں کیا ، بلکہ زندگی کے تصور کو بھی خواہ وہ فرد کی زندگی ہو یا قوم کی ، بلند تر کر دیا ہے ۔ اس کا پیغام حیات ہے جو فرد اور اقوام کی زندگی سے وابستہ ہے ۔ اس میں وہ انسان کی عظمت کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کی عظمت اس کے دنیاوی مرتبے ، حیثیت ، قومی وقار ، وطنی نسبت یا نسل و رنگ کی وجہ سے نہیں ،

بلکہ اس کی فطرت کی بلندی کی وجہ سے ہے ۔ انسان میں عقل و دل کی کشمش جاری ہے ۔ ایک طرف اس کا ذاتی نفع اور نقصان ہوتا ہے اور دوسری طرف کسی بلند تر مقصد کے حصول کا خیال اور جذبہ ، یہ جذبہ ذوق یقین سے مستحکم ہوتا ہے پھر وہ کچھ کر دکھاتا ہے کہ عام دنیاوی وسائل اور اسباب سے ممکن نہیں ۔ اسی بلند تر مقصد اور نصب العین سے انسانی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے جس کا دوسرا نام خودی ہے ۔ لیکن کوئی شخصیت یا کردار صحیح منعوں میں مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ ایک بڑی انا سے جسے سوسائٹی کہتے ہیں ، اپنے آپ کو وابستہ کر کے اس سے یگانگت پیدا نہیں کرتا ۔ یہی سے خودی ، بے خودی کے مقام میں داخل ہوتی ہے ۔

غرض کہ اقبال نے انسانی زندگی کے اس بلند تصور سے اردو ادب کے شعری اور فنی محرکات کا مقام اونچا کر دیا ۔ فارسی شاعری میں جو کام تصوف نے کیا تھا ، وہی کام اقبال کے کلام نے اردو میں کیا ہے ۔ اس سے نہ صرف ہماری معاشرتی ، اور اخلاقی اقدار ہی بلند ہوئی ہیں ، بلکہ ہمارے ادبی نظریات اور ان کا نصب العین بھی بدل گیا ہے ۔

اوپر فارسی شاعری کا ذکر ہوا ۔ فارسی ادب و شعر کی کم و بیش ہزار سالہ تاریخ بتاتی ہے کہ کس طرح بڑے بڑے جلیل القدر شعرا اور مفکر ادیبوں نے اس کے ادب میں وسعت ، عظمت اور پاکیزگی پیدا کی ۔ عشق و محبت کے پاکیزہ جذبات ، بلند پند و نصائح اور دقیق مسائل حکمت سے اس کا دامن بھر دیا ۔ اردو شاعری ایسے جواہر پاروں سے خالی تھی ۔ مرزا غالب کے علاوہ یہ بلند اور وسیع اور دقیق تصورات حیات ہمیں اور جگہ خال خال نظر آتے ہیں ۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کو غالب کی شاعری اور اس کے افکار مرغوب تھے ۔ اقبال نے اگرچہ اس بات کا اعلان نہیں کیا ، لیکن وہ یقیناً مرزا

موصوف کی شاعری کو جدید شاعری کا پیش خیمہ تصور کرتے تھے اور ان کی مجتہدانہ عظمت کے قائل تھے ۔

اقبال کا اپنا کارنامہ بھی اس ضمن میں غالب سے بدرجہا بلند ہے ۔ اس نے فلسفیانہ مسائل کو جو بے حد لطیف ، دقیق ، پیچیدہ اور خشک ہوتے ہیں ، شعر و ادب کا موضوع بنا کر تازہ اور شگفتہ بنا دیا ، مجرد خیالات کو مادی حقائق کی صورت میں ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ۔ اب وہ خیالات ہمارے لیے کوئی معمہ نہیں ، محض ذہنی کاوشیں نہیں جو چند مفکر انسانوں کا مشغلہ ہوتی ہیں ۔ وہ شعری تاثرات ہیں ـــ جمالیاتی لذتیں جو ہمارے دل و دماغ پر طاری ہو جاتی ہیں ۔ یہ مسائل شعر بن کر ہمارے قریب تر ہو گئے ہیں اور محض ذہنوں کے قریب نہیں ، بلکہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں ۔ وہ ہماری زندگی کا جز بن جاتے ہیں ۔ ہم انھیں کوئی غیر معمولی یا اجنبی تجربات نہیں تصور کرتے ، بلکہ وہ ہمارے تجربات بن جاتے ہیں ۔

اردو شاعری میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے ۔

حالی نے جب قدیم اردو شاعری پر اعتراضات کیے تو سب سے زیادہ زور دو باتوں پر دیا ، ایک تو یہ کہ گل و بلبل کے افسانے فرسودہ ہو گئے اور دوسرے غزل کی صنف نے ہماری شاعری کے دائرے کو محدود اور تنگ کر رکھا ہے اور اس میں کسی مسلسل اور مربوط موضوع سخن کی سمائی نہیں ہو سکتی ۔ یہاں حالی کے ان نظریات پر بحث کرنے کا موقع نہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ مرور زمانہ کے باوجود پھول ہمیشہ ہی جاذب نظر رہتا ہے اور بلبل کے نغمے کبھی افسردہ نہیں ہوتے ۔ خیر ان باتوں سے قطع نظر حالی نے اپنی شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا تھا ، اس میں ایک بنیادی حقیقت یہ تھی کہ گل و بلبل تو درکنار اس کائنات کی ہر شے ہمارے شعرا کی نظر میں فرسودہ اور جامد ہو کر رہ گئی تھی ۔ وہ خارجی اشیاء

کو نئے رنگ روپ میں دیکھنے کہ خوگر نہ تھے ، اس لیے کہ خود ان کی اپنی زندگی میں جمود اور ابتذال آ گیا تھا ۔ وہ ایک ہی طرح اور ایک ہی سمت دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے ۔ زندگی میں سکت نہیں تھی تو مشاہدوں اور تجربوں میں سکت کہاں سے آتی ۔ اور تو اور محبت کے جذبات میں بھی مصنوعی پن آ گیا تھا ۔ ان کے جذباتی تجربے ایک ہی سانچے میں ڈھل کر نکلتے تھے ۔ دیدار کی ایک لذت ، وصال کا ایک ہی مزہ اور فراق کا ایک ہی دکھ تھا جسے سب اپنی اپنی قسمت کے مطابق سہے تھے ۔

اس یک رنگی نے زبان کی طنابیں بھی کھینچ رکھی تھیں ۔ رفتہ رفتہ الفاظ میں بھی افسردگی آ گئی تھی ۔ ان کا مفہوم متعین ہو چکا تھا ۔ وہ چند شعری علامتیں تھیں اور ان کا پھیلاؤ محدود تھا ۔ وہ بے جان ہو کر رہ گئے تھے ۔ ان کی معنویت ختم ہو گئی تھی ۔

اقبال کی شاعری نے ان الفاظ کو از سرنو زندگی عطا کی ، ان میں نئی جان ڈالی ، ان کی معنویت کو بدل دیا ۔

غزل میں جس چیز کو تغزل کہتے ہیں ، وہ در اصل اسلوب بیان کی خوبی اور حسن ادا کا نام ہے ۔ اقبال نے اس تغزل کو بھی قائم رکھا ہے اور غزل میں وہ تمام لوازمات ملحوظ رکھے ہیں جن میں رمز و ایماء کے ساتھ ساتھ پرانی علامتوں سے کام لیا جاتا ہے ، لیکن ان علامتوں اور تلمیحوں کی اپنی نئی بصیرتوں کی روشنی میں باز آفرینی کی ہے اور اس سے غزل میں تازگی اور جدت آ گئی ہے ۔

اس طرح کی جدت آفرینیوں سے اقبال نے اپنی شاعرانہ معنی آفرینیوں سے تقریباً تمام علامات اور شعری روایات کے مفہوم کو بدل دیا ہے ۔ اس کے یہاں گل و بلبل ، زلف و رخسار ، جام و ساقی ، عشق و محبت کفر و ایماں کا شاعرانہ تصور اور ان کی جذباتی کیفیات بالکل مختلف ہیں ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی![1]

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر![2]

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی![3]

وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے
طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوۂ ساقی![4]

یہاں بلبل ، نالہ ، گیسو ، کافر ، مومن ، ساقی سب کی معنویت نئی ہے -

مرزا غالب نے تلمیحات کے معتقداتی پہلوؤں کے خلاف احتجاج کیا تھا ، اقبال نے ان تلمیحات کے نئے نئے پہلو نمایاں کیے ہیں - اس طرح کہ ان کے پس منظر میں جو داستانی عناصر ہیں ، بدلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں - اور ان کو بالکل جدید اور نئے ماحول میں لا کر رکھ دیا ہے جس سے ان کے تلمیحی تصورات میں بنیادی تبدیلی آ گئی ہے - سنیے :

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا![5]

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہے پھر کیا!
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی![6]

۱- کلیاتِ اقبال ، بانگ درا ، ص ۲۷۸ -
۲- ایضاً ، بال جبریل ، ص ۲۹۹ -
۳- ایضاً ، ص ۳۲۷ -
۴- ایضاً ، ص ۳۵۰ -
۵- ایضاً ، ص ۳۱۷ -
۶- ایضاً ، ص ۳۳۲ -

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کار بے بنیاد !؎

یہاں کوہکن ، پرویزی ، برہمن ، کلیمی ، عصا ، فرعون ، ید بیضا نئی نئی معنویت لیے ہوئے ہیں اور اب وہ بالکل عہد حاضر کے کردار ہیں ، جن سے ان کی کہنگی از سرِ نو تازہ ہو گئی ہے اور وہ مؤثر شعری حربے بن گئے ہیں ۔

اقبال کا یہ کارنامہ بھی بہت بڑا کارنامہ ہے ۔

اقبال نے ابتدا میں جب ''گل رنگین'' ''شمع و پروانہ'' ''ابر کہسار'' ''ماہ نو'' وغیرہ کی نظمیں لکھیں تو اس وقت بھی ان اشیاء کو انھوں نے نیا رنگ روپ عطا کیا ان کا لکھا ہوا والدہ کا مرثیہ ایک بچے کا ماتم ہی نہیں جو کسی گوشے میں بیٹھا ہوا اپنی امی کی جدائی پر فریاد کرتا ہے ، بلکہ بزرگ مفکر کا گریۂ خاموش ہے جو آہستہ آہستہ اشک فشاں ہے ، لیکن اس کی آہ خاموش سے ایک دنیا غم میں ڈوب جاتی ہے ۔

اس کے بعد کی نظموں میں ''مسجد قرطبہ'' ''ساقی نامہ'' نئے نئے شعری اشارے ہیں جن میں انسانی زندگی ، اس کے اعلیٰ مقاصد ، اس کے فنون کی کار فرمائیاں پورے طور پر ہمارے سامنے آ جاتی ہیں ۔ مسجد قرطبہ خشت و سنگ کی عمارت نہیں ، بلکہ تمدنی علامت ہے جس کی بنیاد ایک معیاری شخصیت و کردار پر رکھی گئی ہے ۔

اقبال نے شاعری میں کوئی عروضی اجتہادات نہیں کیے ، لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں بعض نئے نئے اور کامیاب تجربات ملتے ہیں ۔ مثلاً بال جبریل میں بیشتر غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں جن میں باقاعدہ قافیہ ردیف کی جگہ روی کا استعمال کثرت سے ہوا ہے ۔

؎ کلیات اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۶۲ ۔

باقاعدہ قافیہ ردیف کے نہ ہونے سے شعر میں جو موسیقیت کم ہو جاتی ہے شاعر نے اس کی تلافی ایسی شعری مہارت سے کی ہے کہ اس تبدیلی کا احساس تک نہیں ہوتا ۔ الفاظ کی نشست و ترکیب ان کی آوازوں کا زیر و بم ، شعر کا اندرونی ترنم ، سب مل کر ایک مخصوص اثر پیدا کرتے ہیں ۔

اقبال کو اپنے فلسفیانہ اور دقیق خیالات اور شعری تأثرات کو بیان کرنے کے لیے نئے نئے الفاظ اور ان کی ترکیبیں وضع کرنی پڑی ہیں ۔ عاعر نے انھیں اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ بالکل اجنی معلوم نہیں ہوتیں ۔ یہاں تفصیل سے کام نہیں لیا جا سکتا ، فقط ایک غزل کے چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں :

امین راز ہے مردان حُر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے ؟
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی !
نگاہ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں
نہ آہ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی !
طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی[۸] !

۸- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۲۱ ، ۳۲۲ ۔

اقبال کی ایک نظم
''والدۂ مرحومہ کی یاد میں''*

-- ایک جائزہ --

یہ نظم ایک مرثیہ ہے جو اقبال نے اپنی والدہ محترمہ کی وفات پر لکھا تھا اور جو آن کے مجموعہ کلام ''بانگ درا'' میں شامل ہے اور ان کی کامیاب طویل نظموں میں شمار ہوتی ہے - لیکن یہ نظم اپنے موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے آن کی دوسری طویل نظموں سے الگ حیثیت رکھتی ہے - اس نظم میں وہ قومی پس منظر اور ملی جذبات کا اظہار نہیں پایا جاتا جو ان کی باقی نظموں کا مابہ الامتیاز ہے -

ادب میں قومی شاعری کا دائرہ محدود ہوتا ہے - اثر و نفوذ کے اعتبار سے قومی شاعری زود اثر ہوتی ہے افسردہ دلوں کو گرمانے اور سوئی ہوئی قوتوں کو جگانے میں معجزے کا کام کرتی ہے اس سے مردہ قوتیں بیدار ہو کر پستی سے بلندی کی طرف آبھرتی اور تنزل سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں - لیکن ان نظموں کا اثر دیرپا نہیں ہوتا اور آن کی ہنگامی اور عارضی اہمیت ، ماحول اور صورت حالات کے بدلتے ہی زائل ہونے لگتی ہے -

اقبال نے اپنی قومی شاعری میں عمیق فلسفیانہ اذکار کو داخل کر کے اس کی ماہیت کو بدل دیا شاعر کا مطمح نظر اتنا وسیع تھا

---

* مطبوعہ روزنامہ 'امروز' لاہور ، ۲۲ اپریل ۱۹۵۶ء ، ص ۵ -

کہ اس کی شاعری میں خود بخود آفاقی وسعت پیدا ہوئی ۔ اس کے اخلاص اور ذوق یقین نے اس میں بے پناہ قوتیں بھر دیں ۔ اس کے فنی کمالات اور ماہرانہ چابک دستی نے شاعرانہ عناصر شامل کرکے قومی نظموں کو ادب کا مستقل شاہکار بنا دیا ۔ اقبال کی یہ قومی نظمیں ابدیت کی ایک ایسی فضا میں گونجتی ہیں کہ ان کا مطالعہ حالات کے بدل جانے پر بھی انسانی دل و دماغ اور روح میں تازگی اور آسودگی پیدا کرتا رہے گا ۔

اصناف سخن میں مرثیہ کی بھی کم و بیش وہی حیثیت ہوا کرتی ہے ۔ شاعر اس میں کسی المناک حادثے کا ذکر کرکے اپنے تیز اور مشتعل جذبات کے اظہار سے سننے والوں کے جذبات کو بھی تیز تر کرتا اور پھڑکاتا ہے سننے والے اسی کی طرح کلپنے اور تڑپنے لگتے ہیں جس طرح غیر سے غیر آدمی بھی کسی معصوم بچے کی دردناک آواز اور کسی نوجوان بیوہ کی فریاد سن کر بے تاب ہو جاتا ہے اور باوجود بیگانگی کے بین کرنے والے اور اپنے درمیان جذباتی یگانگت پیدا کر لیتا ہے ، اسی طرح ”مرثیہ“ ایک ایسی غمناک پکار ہوتی ہے کہ سننے والے ، ہنگامی طور پر ہی سہی ، خود بخود اُدھر کھنچے چلے جاتے ہیں ۔ لیکن جونہی وہ منظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ ان المناک آوازوں اور فریادوں کی گونج بھی مدھم پڑ جاتی ہے ۔ اور رفتہ رفتہ فضا میں کھو جاتی ہے ۔

فارسی اور اردو شاعری میں مرثیہ کا دائرہ محدود رہا ہے ۔ اس کا اطلاق بالعموم ایسی نظم پر ہوتا ہے ، جس میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور اہل بیت کے مصائب کا بیان ہو ۔ فارسی اور اُردو شاعری کی دوسری اصناف کی طرح مرثیہ بھی بعض رسمی اور روایتی فنکاریوں کے ہاتھوں دبتا چلا گیا ۔ اس میں شک نہیں کہ اس وسیع طومار میں بعض شاعرانہ جوہر ریزے بھی مل جاتے ہیں ۔ اور عام طور پر یہ مرثیے مخلصانہ عقیدت مندی اور ایمان پروری کے اعلیٰ

نمونے ہیں ان میں ادبی ہنر مندی کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ اُن کے لکھنے والوں نے ان مرثیوں کے ذریعے ادب و شعر میں نئی راہیں بھی کھولی ہیں ۔ لیکن ان مرثیوں کے کردار اگر زندہ اور پائندہ ہیں تو اس لیے نہیں کہ انھیں کسی کے شاعرانہ کمال فن نے زندہ کیا یا چمکایا ہے ۔ بلکہ اس لیے کہ وہ خود بہت بلند کردار تھے اور ان میں نمایاں ہونے اور زندہ رہنے کی قوتیں طبعاً موجود تھیں ۔ گویا شاعر کی شاعری خود انہی ہستیوں کی عظمت کی بدولت زندہ ہوئی ۔

فردوسی نے جب کہا تھا کہ

منش کردہ ام رستم پہلوان وگر نہ یلے بود در سیستان[1]

تو اس نے ایک بہت بڑی شاعرانہ حقیقت کا انکشاف کیا تھا ۔ فردوسی نے نہ صرف اپنے رزمیہ اشعار سے ایک سیستانی انسان کو رستم پہلوان بنا دیا ۔ بلکہ اس کے فرزند سہراب کی حسرت ناک موت لکھ کر اسے ایک عالمگیر سانحہ بنا دیا ۔

اُردو شاعری میں سودا کے شہر آشوب اور بالخصوص میر کے ذاتی نوحے ، میری نظر میں کامیاب مرثیے ہیں ۔ میر نے اپنے گھر کی بربادی کا رونا اس طرح رویا کہ گھر کے نام و نشان مٹنے پر بھی اس کی پکار فضا میں گونجتی سنائی دیتی ہے اور اس عالمگیر حقیقت کو آشکار کرتی ہے ۔ کہ اہل کمال کا دنیا میں کیا حشر ہوتا ہے ۔

مرزا غالب نے عارف اور اپنی محبوبہ کا مرثیہ لکھ کر اُردو ادب و شعر کی اس صنف میں ایک نئی راہ کھول دی ۔ جب لوگوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ :

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے[2]

۱- شاہ نامہ از فردوسی (جلد اول) ص ۵۹۲ ، شائع کردہ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۔
۲- دیوان غالب اردو (نسخہ عرشی) مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ (۱۹۵۸) ، ص ۲۰۴ ۔

کے اشعار ایک مخصوص ہستی کی موت سے وابستہ ہیں اس وقت بھی اس نظم یا غزل کی جاذبیت بدستور قائم تھی ۔

حالی نے غالب کا مرثیہ لکھا تو ایک شفیق استاد کی یاد کو زندہ کر دیا لیکن اقبال کی نظم یہ عنوان ''غالب'' ایک ''فنکار'' کی موت کا مرثیہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی ہمہ گیری حالی کے مرثیے سے کہیں زیادہ ہے ۔

ماں کی موت ایک ایسا حادثہ ہے جس سے تمام انسان بلکہ حیوان اور پرندے بھی متاثر ہوئے ہیں ۔ اور اس حادثے کا اثر بھی اپنے اپنے حلقے میں ہر جنس کے افراد پر کم و بیش یکساں ہوتا ہے اس اعتبار سے یہ حادثہ کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں کہ جس کے رو پذیر ہونے سے دنیا میں کوئی غیر معمولی ہیجان یا انقلاب پیدا ہو جائے لیکن اس حادثے پر اقبال کا تاثیر غم بالکل جدا گانہ ہے ۔ وہ ایک یتیم بچے کی طرح زار زار نہیں روتا بلکہ ایک بالغ نوجوان کی طرح دم بخود خاموش دیکھ رہا ہے اور متانت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اگرچہ اس کی یہ خاموشی نادان بچے کی فریادوں سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ اس حادثے سے اقبال نے فقط جذباتی تاثر نہیں لیا ۔ بلکہ ایک بالغ نظر مفکر کی طرح اس میں بہت سے حقائق کا بھی مشاہدہ کیا ہے ۔ وہ اس مشاہدے کو محض اپنے ذہنی تجربے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ دوسروں سے ان حقائق کو محسوس بھی کراتا ہے ۔

غرض اس نظم میں اس حادثے کی ایک شاعرانہ ترجمانی کی کی گئی ہے اور اس ترجمانی میں منکشف شدہ حقائق کو حسین اور دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے ۔ اشعار کی یہ دلکشی اس لطیف امتزاج کا نتیجہ ہے جو عمیق خیالات و جذبات کے درمیان نظر آتا ہے ۔ اس نظم میں جذبات کا سطحی ابھار نہیں بلکہ جذبات افکار کی عمیق گہری سطح کے ساتھ ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلتے ہیں ۔ اس نظم کے پس منظر میں شور و غوغا نہیں بلکہ ایک خموش متین سی

ماتمی فضا قائم کی گئی ہے - جس میں افکار و جذبات کی رو آہستہ آہستہ حرکت کرتی دکھائی دیتی ہے اور دیکھنے والے کے دل اور دماغ و دلوں کو بیک وقت متاثر کرتی ہے -

شاعر نے اس نظم کو مجموعی تجربے کی صورت میں متصور کیا ہے - اس لیے اس کے متفرق اجزا ایک دوسرے کے طور پر دیکھنے اور پرکھنے سے اس کی شعری تکمیل میں فرق آجاتا ہے نظم کا نفسیاتی تسلسل شاعر کی فکری گرفت اور اس کی ذہنی وسعت کو واضح کرتا ہے - یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس تسلسل میں ایک منطقی رابطہ ہے کہ نظم کا ہر حصہ پہلے حصے سے لازمی نتیجے کے طور پر وجود میں آیا ہے - اس سے نظم میں ایک قدرتی ارتقا پیدا ہو گیا ہے اور اس ارتقا کے مختلف مراحل بالتدریج نظم کی تکمیل میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ نظم کی آخری منزل آ پہنچتی ہے -

اقبال رمز و ایما سے بہت کام لیتا ہے - ایمائی قوتیں اس کے فلسفیانہ مزاج اور عمیق افکار سے مناسبت بھی رکھتی ہیں - رمزوایما اشارہ اور کنایہ غزلیہ شاعری کی جان ہیں یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی اقبال کی طویل نظموں میں غزلیہ اشعار کا رنگ غالب آ جاتا ہے یعنی بعض اشعار اتنے جامع اور اتنے مکمل ہوتے ہیں کہ دوسرے اشعار سے ان کے مربوط ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے - زیر بحث نظم اس طرح کی خامیوں سے پاک ہے - باوجود اس کے کہ اس میں مختلف النوع مضامین کا اظہار کیا گیا ہے - مرکزی یگانگت اور اس پر شاعر کا ذہنی تسلط اس قدر غالب ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن ایک لمحے کے لیے بھی راستے سے ادھر اُدھر نہیں بھٹکتا -

نظم کے ان مختلف النوع عناصر پر غور کیجیے نظم کی ابتداء اس بات سے ہوتی ہے کہ کائنات کی ہر شے مجبور ہے - اور نظامِ قدرت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے :

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے ، شمس و قمر مجبور ہیں
انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیر عالمگیر میں ہر شے اسیر[۳]

ایک ہوش مند ، مفکر انسان اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ آلام انسانی کے راز کو جانتا ہے اور شکایت نہیں کرتا ۔ فریاد کی بجائے وہ ضبط و متانت سے کام لیتا ہے ۔ لیکن پھر بھی اس عالمِ مجبوری میں بعض واقعات ایسے بھی ظہور میں آتے ہیں کہ بڑی سے بڑی قوتیں شکست کھا جاتی ہیں ۔ اور متانت کے پہاڑ جگہ سے ہل جاتے ہیں ۔ انہی واقعات میں ایک واقعہ ''مرگِ مادر'' بھی ہے جو اقبال کے الفاظ میں ''حکمتِ محکم کی تردید'' ہے ۔ اس مقام پر ایک فلسفی بھی ایک نادان بچے کی طرح روتا چیختا اور آہ و بقا کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس منزل پر طفلی و پیری ، عقل و خرد اور نادانی سب کے ڈانڈے مل جاتے ہیں :

علم کی سنجیدہ گفتاری ، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت ، جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صبحتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم[۴]

غرض یہ دنیا اس مختلف النوع عناصر کی کشکمش سے ایک

۳۔ کلیات اقبال ، حصہ بانگ درا ، ص ۲۲۶ ۔
۴۔ ایضاً ، ص ۲۲۸ ۔

عجیب ماتم خانہ بنی ہوئی ہے - جس سے زندگی دشوار اور موت اس سے نجات کا ذریعہ متصور ہونے کے باعث آسان نظر آتی ہے :

کتنی مشکل زندگی ہے ! کس قدر آساں ہے موت !
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت !

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت !!
دشت و در میں ، شہر میں ، گلشن میں ، ویرانے میں
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں[۵]

لیکن زندگی اتنی حقیر شے نہیں کہ وہ موت آنے پر ختم ہو جائے - قدرت کی نظر میں بڑی گراں قدر ہے اس لیے اس کے محفوظ رکھنے کے لیے قدرت نے ہر چیز میں حفظ زندگی کا ذوق ودیعت کیا ہے موت دراصل زندگی کی مسلسل رہ میں ایک مرحلے کا نام ہے جس کے بعد زندگی نئی تازگی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے :

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا[۶]

ستاروں کو دیکھو ہر روز صبح کو فنا ہونے پر رات کو پھر رونما ہو جاتے ہیں - اتنے حادثات مرگ کے باوجود اُن کی زندگی کتنی طویل ہے - جہاں ''سرگزشت نوع انسان'' ایک ساعت معلوم ہوتی ہے - لیکن اگر آسمان کے یہ شرارے زندہ رہتے تو کیا انسان جو اپنے مقاصد زیست میں ان میں کہیں برتر اور پاکیزہ تر ہے فنا ہو سکتا ہے :

۵- کلیاتِ اقبال ، حصہ بانگ درا ، ص ۲۳۰ -
۶- ایضاً ، ص ۲۳۲ -

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا ؟
کم بہا ہے آفتاب اپنے ستاروں سے بھی کیا ؟[۷]

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرورِ زمان کے ساتھ غم کے زخم مٹ جاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا اور اگر انسان عارضی طور پر کسی غم کو بھول بھی جاتا ہے اور ضبط سے کام لیتا ہے ۔ تو اس لیے کہ اس کے دل کے ایک گوشے میں یہ نامعلوم سا احساس بھی ہوتا ہے :

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں[۸]

انساں کا وقتی طور پر کسی غم کو بھول جانا اس کی غفلت نہیں بلکہ اس حقیقت سے آگاہی کی دلیل ہے ۔

اسی بنا پر وہ اپنی والدۂ مرحومہ سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ میں نے اپنے دل میں تیری یاد کو محفوظ کر لیا ہے ۔ اس زندگی میں لاکھوں بے ثبات جہان آبھرتے اور مٹ جاتے ہیں ، آن میں ایک جہانِ آخرت بھی ہے ۔ آخرت بھی زندگی کی ایک جولا نگاہ ہے ۔ وہاں بھی وہی تگ و دو اور رہی ذوقِ عمل کار فرما ہوگا ۔ تیری زندگی اس جہان میں پاکیزہ و تابندہ تھی ۔ آخرت میں بھی اس کی پاکیزگی اور تابندگی کا یہی عالم رہے گا ۔

یہاں نظم کا اختتام ہوتا ہے اور یہ اختتام محض منطقی تسلسل کا لازمی نتیجہ نہیں ۔ بلکہ شاعر نے اس میں عقیدت اور محبت کے احساسات کو شامل کرکے اس میں شاعرانہ کیفیت بھر دی ہے :

۷۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۲۳۳ ۔
۸۔ ایضاً ، ص ۲۳۴ ۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو تیرا !
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا !
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے !
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے ![۹]

اقبال نے اس نظم کے لیے ایسی بحر انتخاب کی ہے جو خیالات اور جذبات سے ہم آہنگ ہے اور فارسی الفاظ و تراکیب کی شوکت ، مضمون کی عظمت کا ساتھ دیتی چلی جاتی ہے ۔ جس سے نظم کی متین لے میں کہیں فرق نہیں آتا ۔ چند شعر مثال کے طور پر دیکھیے ۔

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں
گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

آہ ! یہ دنیا ، یہ ماتم خانۂ برناو پیر!!
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

نے مجالِ شکوہ ہے ، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے ، اک طوقِ گلو افشار ہے

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے[۱۰]

۹۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۲۳۶ ۔
۱۰۔ ایضاً ، صفحات ۲۲۶ ، ۲۲۷ ، ۲۳۰ ، ۲۳۱ ۔

کہیں کہیں جذبات کی رو گہرائی سے اُبھر بھی آتی ہے :

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ ! میرا انتظار ؟
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار ؟
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب، میں کس کو میں یاد آؤں گا"[11]

لیکن یہاں بھی اظہارِ جذبات میں نوحہ کا سا جوش و خروش نہیں بلکہ ایک بالغ انسان کا متین احساس غم ہے - جو نمایاں تو نہیں مگر شدید اور پائدار ہے -

غرض اقبال نے اس مرثیے میں اپنی والدۂ محترمہ کے سانحۂ مرگ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر ایک عالمگیر سانحہ بن جاتا ہے - اور یہی ایک کامیاب مرثیے کی علامت ہوا کرتی ہے -

---

۱۱- کلیاتِ اقبال ، حصہ بانگ درا ، ص ۲۲۸ -

اقبال اور تغزل*

تغزل کا لفظ بالعموم ایک مخصوص صنفِ شعر سے جسے غزل کہتے ہیں ۔ منسوب کیا جاتا ہے ۔ صاحبِ ذوق اصحاب جب غزل کے کسی اچھے شعر کی داد دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس شعر میں شانِ تغزل پائی جاتی ہے ۔ چونکہ غزل میں عام طور پر عاشقانہ خیالات و جذبات کا اظہار ہوتا ہے اس لیے لوگ تغزل کو عشقیہ واردات سے مختص کر لیتے ہیں ۔ دراصل تغزل کسی معین موضوع سے وابستہ نہیں بلکہ ایک مخصوص اسلوب بیان کا نام ہے جو غزل میں بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے ۔

غزل کا ڈھانچہ باقی اصنافِ سخن سے بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے اس کا ہر شعر ایک مکمل نظم کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ کسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے بے حد اختصار کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے غزل کا اولیں مابہ الامتیاز اختصار ہے ۔ شاعر اس اختصار کو پیدا کرنے کے لیے نہ صرف کم از کم الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ اس لفظی کفایت شعاری کے لیے رمز و ایما اور کنائے سے بھی کام لیتا ہے ۔ اس سے غزلیہ اشعار میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ قوتِ بیان اور جذبات کی شدت اور مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

ولی اور میر سے لے کر غالب تک اور حالی سے لے کر اقبال تک غزل نے کئی ایک ارتقائی مراحل طے کیے، لیکن اس کے بنیادی

---

* مطبوعہ ہفت روزہ 'لیل و نہار' لاہور ، ۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء ، صفحات صفحات ۱۷ - ۱۸ -

اسلوب بیان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اقبال فقط فن کار ہی نہیں وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی ہے۔ اس کے لیے غزلیہ اسلوبِ بیان زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں تغزل کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

اقبال نے غزلیں ہی نہیں لکھیں مختصر اور طویل نظمیں بھی لکھی ہیں بلکہ اس کی شاعری کے بہترین شہکار اس کی طویل نظمیں ہی ہیں جو مستقل اور جدا گانہ کتابوں پر مشتمل ہیں جیسے اسرار و رموز اور جاوید نامہ۔

طویل نظمیں صراحت کی متقاضی ہوتی ہیں۔ شاعر کے لیے لازمی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو وضاحت سے بیان کرے۔ اور اس کے اندازِ بیان میں منطقی ربط و تسلسل ہو، تاکہ نظم کے اجزا بکھرنے نہ پائیں۔ اور جذبات میں انتشار پیدا نہ ہو۔ یہ تمام لوازم طوالت چاہتے ہیں لیکن اقبال کی نظموں میں ان شعری اور فنی تقاضاؤں کے باوجود تغزل کا رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

اقبال کی ابتدائی نظمیں مثلاً ہمالہ، شکوہ، جوابِ شکوہ، والدۂ مرحومہ کی یاد میں، شمع و شاعر، وغیرہ۔ اس مخصوص رنگ سے قدرے متشنلی ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ شاعر کے افکار میں پختگی آتی چلی گئی اور اس کے شعری معتقدات میں مرکزیت، قوت اور شدت کا انداز پیدا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں اس کے افکار واضح اور روشن ہوتے چلے گئے اور اس کی فنکارانہ مہارتیں پوری قوت کے ساتھ بروئے کار آنے لگیں۔ غزل کا رنگ تو بدلنا ہی تھا نظموں میں تغزل کا انداز اور بھی چمکا۔ یہ انداز تغزل شاعر کی فارسی اور اردو نظموں میں موجود ہے۔ مثلاً فارسی میں کرمک شب تاب سرود انجم تنہائی اور بندگی۔ اردو میں سینما، ساقی نامہ اور مسجد قرطبہ تغزل نگاری کے عمدہ مرقعے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں اقبال کے تغزل کو تفصیل سے بیان کرنا مشکل ہے اس لیے میں صرف چند مثالیں بیان کروں گا ۔ اُن کی فارسی نظم 'کرمک شب تاب' کو لیجیے ۔ اس نظم کا پہلا بند ہے ۔

یک ذرۂ بے مایہ متاع نفس اندوخت
شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پنہائے شب افروخت[1]

اس بند کا پہلا مصرعہ ہی اس بند کی جان ہے ۔ کرمک شب تاب یعنی جگنو کے لیے ذرہ بے مایہ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے یہ ایک ایسا حقیر ذرہ ہے جس میں جان پڑ گئی ہے ۔ اور عشق کی بے تابیوں اور تڑپ نے اُسے پروانہ بنا دیا ہے ۔

شب کی تاریکی میں جگنو کی چمک اور اس کا ہر لحظہ نظر آنا اور چھپنا ایک خاص کیفیت رکھتا ہے شاعر نے اس کیفیت کو ایک مصرعے میں یوں بیان کیا ہے :

ای کرمکِ شب تاب سراپای تو نور است
پرواز تویک سلسلۂ غیب و حضور است[2]

دیکھیے ''پرواز تویک سلسلۂ غیب و حضور است'' میں کتنا اختصار ہے ۔ اور پھر اس اختصار میں جگنو کی زندگی کتنی واضح اور شوخ نظر آتی ہے ۔ سلسلۂ غیب و حضور کے الفاظ کا معنوی پس منظر اور لفظوں کی موسیقیت نے بیان میں گہرائی اور دلآویزی پیدا کر دی ہے یہ مصرعہ نظم کا نہیں غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے ۔

''سرود انجم'' کی نظم پہلی عالمگیر جنگ کے بعد لکھی گئی تھی ۔ اس نظم میں شاعر نے بعض عالمگیر سیاسی اور معاشرتی انقلاب

۱- کلیاتِ اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۶۷ ۔
۲- ایضاً ، ص ۲۷۷ ۔

کو ستاروں کی زبان سے بیان کیا ہے ۔

جنگ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

گرمی کار زار ہا　　خامیٔ پختہ کار ہا
تاج و سریر و دار ہا　　خواریٔ شہر یار ہا
بازیٔ روز گار ہا
می نگریم و می رویم[۳]

بڑی بڑی جنگیں کیا ہیں ؟ بڑے بڑے مدبران سیاست کے چشم و ابرو کے ایک اشارے یا جنبش قلم سے معرض وجود میں آتی ہیں ۔ ان کے ہولناک نتائج دنیا میں قیامتیں برپا کر دیتے ہیں ۔ عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ جاتے ہیں ۔ بادشاہ گدا اور گدا وارث تخت و تاج بن جاتا ہے ۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن فطرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ۔ انسانوں سے یوں کھیلتی نظر آتی ہے ۔ جیسے کوئی نادان بچہ کھلونے سے کھیل رہا ہو کہ جب چاہا اسے نہایت بے اعتنائی سے توڑ دیا ۔

دیکھیے اتنے بڑے اور وسیع مضمون کو ہمارے شاعر نے کس فنکارانہ مہارت کے ساتھ ادا کیا ہے ۔ گرمی کار زارہا اور خامی پختہ کارہا کے چار لفظ ہولناک نبردآزمائیوں کی پوری تاریخ کی تصویر ہیں اور تاج و سریر اور دارہا ۔ پھر بازی روزگار کے مختصر سے مصورانہ نقش اس تصویر کو کتنا اجاگر کرتے ہیں ۔ اس محاکاتی منظر کشی میں لفظوں کا اندرونی ترنم اور ان کا غنائی زیر و بم دیکھیے اس کا نام تغزل ہے ۔

''تنہائی'' کی نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو :

۳- کلیاتِ اقبال ، حصہ بانگ درا ، ص ۲۶۹ ۔

شدم بحضرت یزداں گذشتم از مہ و مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی ز دل و مشت خاکِ من ہمہ دل
چمن خوش است ولی در خور نوایم نیست
تبسمے بہ لب آو رسید و ہیچ نگفت[۴]

اس بند کا آخری مصرعہ کتنا بلیغ ہے۔

''غلامی'' کی نظم میں ایک انسان کی غلامانہ ذہنیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

آدم از بی بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہری داشت ولی نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگی پیش سگی سر خم کرد[۵]

آردو کی نظموں میں آن کی ایک مختصر سی نظم سینما ہے۔ اس نظم میں وہ سینما کی صنعت کا قدیم دستور بت گری یا صنعت آزری سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وہ مذہب تھا اقوامِ عہد کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی ، یہ دوزخ کی مٹی
وہ بت خانہ خاکی ، یہ خاکستری ہے[۶] !

سنیما کی نظم ایک مختصر نظم ہے۔ اس میں غزلیہ عناصر کا

۴۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۲۸۸ ۔
۵۔ ایضاً ، ص ۳۰۴ ۔
۶۔ کلیات اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۴۵۰ ۔

پیدا ہونا ناگزیر تھا ۔ لیکن ان دو طویل نظموں ''ساقی نامہ'' اور ''مسجد قرطبہ'' میں تغزل کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اور اُن کی موجودگی اُن اشعار میں غزل کا رنگ پیدا کرتی ہے ، گویا وہ چھوٹی چھوٹی دو مصرعیہ نظمیں بن جاتی ہیں ۔

میں یہاں ساقی نامے کے چند اشعار ادھر اُدھر سے انتخاب کرکے پیش کرتا ہوں ۔ اس نظم کی ابتداء یوں ہوتی ہے :

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
اِرم بن گیا دامنِ کوہسار !
گل و نرگس و سوسن و نسترن !
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن !
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں !

فضا نیلی نیلی ، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی ، لچکتی ، سرکتی ہوئی
اُچھلتی ، پھسلتی ، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب توسنِ چیر دیتی ہے یہ !

پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ !؎

آگے چل کر زمانے کے نئے تیوروں کا ذکر کرتے ہیں :

زمانے کے انداز بدلے بدلے گئے
نیا راگ ہے ، ساز بدلے گئے

۷۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص: ۴۱۴ ، ۴۱۵ ۔

ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ!
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا[۸]

پھر موجودہ مسلمانان عالم کا تذکرہ کرتے ہیں :

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش!
تمدن ، تصوف ، شریعت ، کلام
بتان عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی![۹]

ہر چند کہ مسلمان میں جذبۂ اسلامی موجزن ہے لیکن قدیم روایات کی پابندی اور رسوم پرستی نے اُسے جکڑ رکھا ہے - وہ مذہب کے بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر فروعی مسائل میں الجھ گیا ہے ایسے نظریات نے اُس کی قوتِ عمل سلب کر لی ہے - اس ساری داستان کو آخری بند کے آخری شعر میں سمو دیا ہے -

اسی طرح متذکرہ بالا باقی اشعار میں خط کشیدہ مصرعوں اور شعروں پر بھی ناقدانہ نظر ڈال کر دیکھیے کہ شاعر نے کس طرح جگہ جگہ تغزل کے گوہر بکھیرے ہیں -

غزل میں اختصار ، ایمائی اسلوب ، ترنم اور غنائی قوتوں کے علاوہ ایک اور اہم عنصر کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے - اور وہ موضوع اور ہئیت کی خوشگوار ہم آہنگی ہے اقبال بحیثیت فنکار کے اس فنکارانہ حربے سے بخوبی آشنا تھا ، اس کی دو نظمیں ''ساقی نامہ''

۸- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۴۱۵ -
۹- ایضاً ، ص ۴۱۵ ، ۴۱۶ -

اور ''مسجد قرطبہ'' اس کے اس فنکارانہ احساس کی دو عمدہ مثالیں ہیں اگرچہ دونوں نظموں میں شاعر کے فلسفۂ حیات کے بنیادی افکار موجود ہیں ۔ لیکن اُس نے دونوں کے لیے الگ، الگ موضوع انتخاب کئے ہیں ، جس سے یہ دونوں نظمیں ایک دوسرے سے مختلف اور جدا گانہ منفرد حیثیت رکھتی ہیں ۔ شاعر نے اپنے کمال فن سے اُن کے لیے الگ الگ بحریں منتخب کی ہیں ۔ ساقی نامے کی بحر مختصر اور چلنت ہے ۔ اور اس کے الفاظ بھی طرب انگیز ہیں ۔

''مسجد قرطبہ'' کا عنوان ثقہ اور پُرتقدیس ہے ۔ اس کے لیے طویل بحر چنی ہے ۔ اور پھر اس میں الفاظ پرشکوہ اور باوقار ہیں جن سے ویسے ہی صوتی اثرات حاصل کیے ہیں ۔ غرض ان عناصر کی آمیزش سے دونوں نظموں میں ایک مخصوص غنائی تاثر پیدا ہوتا ہے جو تغزل کی کیفیت کو ابھارنے میں بہت ساز گار ہے ۔

میں نے اقبال کی غزلوں کا تذکرہ ارادۃً نہیں کیا اس لیے کہ غزل بہرحال غزل ہے اور اس میں تغزل کا ہونا کوئی اچنبا شے نہیں لیکن چند شعر مثال کے طور پر سن لیجیے :

میرِ سپاہ ناسزا ، لشکریاں شکستہ صف
آہ ! وہ تیرِ نیم کش ، جس کا نہ ہو کوئی ہدف[10]

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اووے ، نیلے نیلے ، پیلے پیلے پیرہن''[11]

۱۰- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۳۱ ۔
۱۱- ایضاً ، ص ۳۲۲ ۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ ؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں ![۱۲]

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو تو پھر کیا !
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی ![۱۳]

۱۲- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۱۹ -
۱۳- ایضاً ، ص ۳۳۲ -

اقبال کے کلام میں موضوع اوو ہئیت کی ہم آہنگی*

ایک زمانہ تھا کہ شعر کو نزولِ وحی سے تعبیر کیا جاتا تھا ، لوگ شاعر کو ''تلمیذِ رحمٰن'' اور خود شعرا اپنے ''صریرِ خامہ'' کو ''نوائے سروش'' سمجھتے تھے - اسی تصورِ شعر سے آمد اور آورد کی تفریق پیدا ہوئی تھی اور اچھے اور برے شعر کا امتیازی تجزیہ ناپختہ اور بے رہرو کاوشوں کا باعث بن گیا تھا -

علم اور فن اور ادب شعوری کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں - اقبال کے یہاں فنکارانہ شعور کی بڑی فراوانی ہے - وہ ایک مفکر بھی ہے اور فنکار بھی - اس کے کلام میں عمیق فکر اور دقیق فن کی دل آویز آمیزش ہے - اس کا سب سے بڑا کمال یہی نہیں کہ وہ ایک فلسفی ہے اور اس نے دنیا کو نئی حکمت زندگی سے روشناس کرایا ہے بلکہ اس کی عظمت اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ حکیمانہ افکار کو شعر کے حسین اور رنگین پیرائے سے آراستہ کرتا ہے - وہ ایک مفکر فنکار ہے ، ایک عظیم شاعر - وہ لاکھ کہے کہ مجھے شاعر نہ کہو ، میں غزل گو نہیں : ''نہ زبان کوئی غزل کی ، نہ غزل سے آشنا میں[1]'' -

---

* مطبوعہ 'اقبال ریویو' جنوری ۱۹۶۳ء ، صفحات ۱۴۱ - ۱۵۴ -

۱- بال جبریل ص ۱۷ ، اصل مصرعہ یوں ہے

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں

ہر چند کہیے کہ ہے ، نہیں ہے[۲]

وہ شعر کے محاسن سے آشنا ہے ، وہ غزل کی فنی نزاکتوں کو خوب بھانپتا اور سمجھتا ہے ۔ اسی چیز کا سرسری تجزیہ ہمارے اس مقالے کا مرضوع ہے ۔

موضوعِ سخن سے مراد بنیادی خیال ہی نہیں بلکہ شاعر کا موضوع کی طرف اندازِ رجحان بھی اس میں شامل ہوتا ہے ۔ اس میں شاعر کے مخصوص نقطۂ نظر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور اگر وہ نقطۂ نظر افادی ہے تو یہ بھی دیکھنا لازمی ہے کہ شاعر کے سامعین کون لوگ ہیں ۔

اقبال کی چند ابتدائی غزلوں اور نظموں کو چھوڑ کر اس کے باقی کلام میں یہ عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں ۔ بادی النظر میں ہمیں اقبال کے ہاں کوئی بنیادی لسانی اور عروضی تبدیلیاں نہیں ملتیں ۔ بظاہر اس نے پرانی اصنافِ سخن غزل ، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ سے کام لیا ہے اور پرانے اوزان اور بحریں استعمال کی ہیں ۔ ان کا کلام قدیم عروضی نظام میں سمویا ہوا نظر آتا ہے ۔ لیکن عروض کا تعلق اوزان سے ہوتا ہے ۔ اوزان کا تنوع اور ان کے زحافات ، موسیقی کے زیر و بم سے مربوط ہوتے ہیں ۔ اسی سے مختلف اصناف سخن وجود میں آتی ہیں ۔

ہر صنفِ شعر اور ہر وزن محض نظم یا غزل کی ہیئت کو ترتیب نہیں دیتا بلکہ اس کی اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی ہوتی ہے جو نفسِ مضمون کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اجاگر ہوتی ہے اور

۲۔ دیوان غالب ، شائع کردہ نیا ادارہ ، (س ۔ ن) ص ۱۴۰ ، صحیح شعر یوں ہے ۔

ہاں ، کھائیو مت فریبِ ہستی ہرچند کہیں کہ ہے ، نہیں ہے

خود موضوعِ سخن کو چمکاتی ہے ۔

اصنافِ سخن میں مثنوی کی صنف کو عام طور پر کسی طویل موضوع کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہے اور اس کے لیے سادہ اور چھوٹی بحریں انتخاب کی جاتی ہیں ۔ چنانچہ فارسی میں ''اسرار'' اور ''رموز'' دونوں طویل نظمیں ، مثنوی میں ہیں اور ان کی بحر بھی چھوٹی ہے ۔ لیکن اقبال کی نظم ''ایک شام'' مختصر ہے اور ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' نسبتاً لمبی ہے ، مگر یہ دونوں مثنوی میں ہیں ، اور ایک بحر چھوٹی اور دوسری کی طویل ہے ۔ ان کی طوین نظموں میں ''شکوہ'' مسدس میں ہے ، ''مسجدِ قرطبہ'' ترکیب بند ہے اور ''ساقی نامہ'' مثنوی ہے ۔ آخر یہ تباین کیوں ہے ؟ کیا یہ تباین محض تنوع برائے تنوع کے لیے تھا ؟ نہیں ۔ ان نظموں کے بنیادی خیال الگ الگ ہیں ، ہر نظم میں شاعر کے موضوع کی طرف رجحان کا انداز الگ ہے ، اس کا زاویۂ نگاہ جداگانہ ہے ، اس کے سامعین مختلف ہیں ۔ یوں کہیے کہ ہر نظم کا مزاج الگ ہے اور شاعر نے اسی مزاج کے مطابق صنفِ شعر اور پھر اس صنفِ شعر کے لیے بحر انتخاب کی ہے ۔

نظم ''شکوہ'' ایک بچے کی فریاد ہے جو کبھی جائز اور کبھی ناجائز طریق پر روتا ہے اور ہنگامہ بپا کرتا ہے ۔ اس کی چیخ و پکار کے تقاضوں میں کوئی منطقی ربط یا جذباتی تسلسل نہیں ہوتا ۔ وہ اپنے شور اور غوغا سے محض بڑوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانا اور اپنی بے چارگی کو منوانا چاہتا ہے ۔ مسدس کے چھ مصرعی بند ، بچے کی فریاد کے بے ربط سے ٹکڑے ہیں جنھیں وہ بغیر کسی التزام کے جوڑتا چلا جاتا ہے ۔

اس کے برعکس ان کی نظم ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' ایک کہن سال ، تجربہ کار ، جہاندیدہ ، مفکر بزرگ کی دبی ہوئی ، رکی رکی سی فریاد ہے اس لیے کہ :

علم و حکمت رہزنِ ساماں اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے[۳] !

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نظم میں مرثیے کی سی اثر انگیزی نہیں - یہ ایک بوڑھے انسان کی ہلکی سی آہ ہے جو بچے کی چیخ و پکار سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے - ''والدۂ مرحومہ کی یاد'' میں صرف اقبال کی والدہ کی یاد ہی پوشیدہ نہیں بلکہ ہر ذکی الحس انسان کی والدہ کی یاد سموئی ہوئی ہے - بچے کی فریاد سے بچے کی ماں چونک اٹھتی ہے - اس خاموش فریاد سے دنیا کے دل لرز جاتے ہیں - اس نظم کا تاثر ہمہ گیر ہے ، اس میں آفاقیت ہے -

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ، یہ نظم مثنوی میں ہے اور اس کی بحر لمبی ہے - مثنوی سے اس نظم کے خیالات میں تسلسل اور روانی ابھرتی ہے اور اس کی لمبی بحر سے باتیں کرنے والے کی ثقاہت طبع کا پتا چلتا ہے -

ہمارا نظریہ اقبال کی ایک فارسی نظم سے زیادہ واضح ہو سکے گا - وہ نظم ''تسخیرِ فطرت'' ہے - اس نظم کو شاعر نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے : میلادِ آدم ، انکارِ ابلیس ، اغوائے آدم ، اخراج آدم از بہشت اور صبحِ قیامت - نظم ایک ہے ، خیالات مسلسل اور مربوط ہیں لیکن نظم کے ہر حصے کی ہیئت الگ الگ ہے - پہلے بند کا آغاز یوں ہوتا ہے :

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے ، خود شکنے ، خود نگرے پیدا شد[۴]

۳- کلیات اقبال ، حصہ بانگ درا ، ص ۲۲۷ -
۴- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۵۵ -

"میلادِ آدم" ایک ہنگامہ آفریں حادثہ تھا - شاعر اس ہنگامے کا اعلان بڑے طمطراق سے کرتا ہے - اس بند کی بحر ، اشعار کا اندرونی ترنم ، اس کے قوافی اور ردیف وہی اثر انگیزی پیدا کر رہے ہیں -

دوسرے دو بندوں میں ابلیس کا ذکر ہے جو اس ہنگامے کو دیکھتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا - وہ بڑی متانت اور رعونت سے آدم کا خیر مقدم اور اس کی عظمت سے انکار کرتا ہے ، اور پھر اسے پھسلانے اور بہکانے کے لیے بھی اسی متانت سے سرگرمِ عمل نظر آتا ہے - دیکھیے یہاں بحر اور بحر کے ساتھ طرزِ بیان کا لہجہ کیسے بدلتا ہے :

نوریٔ ناداں نیم ، سجدہ بآدم برم !
او بہ نہاد است خاک ، من بہ نژاد آذرم !

می تپد از سوز من ، خون رگ کائنات
من بہ دوِ صرصرم ، من بہ غوِ تندرم[5]

چوتھے بند میں آدم کے اس کائنات ارضی کی وسیع ، دلکشا فضا میں سانس لینے کا تذکرہ ہے - شاعر نے یہاں نہ صرف بحر کو بدلا ہے بلکہ صنفِ شعر کو بھی بدل دیا ہے - یہ بند ایک غزل ہے جس کا لہجہ طربیہ ہے - لفظوں سے نشاط انگیزی ٹپک رہی ہے :

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دلِ کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہِ آسماں نوردن ، بہ ستارہ راز کردن[6]

۵- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۵۵ -
۶- ایضاً ، ص ۲۵۷ -

شاعر اس نظم کے آخری بند میں آدم کو خدا کے حضور میں دکھاتا ہے جہاں وہ اپنی انسانی عظمت کو بیان کرتا ہے ، لیکن نہایت عجز و احترام کے ساتھ بیان کرتا ہے - اس کے طرزِ بیان میں طمطراق نہیں ، انکسار ہے ، لجاجت ہے - چنانچہ اشعار کا لہجہ بھی اسی کے مطابق بدلتا ہے :

اے کہ ز خورشیدِ تو کوکبِ جاں مستنیر
از دلم افروختی شمعِ جہانِ ضریر
گرچہ فسونش مرا برد ز راہِ صواب
از غلطم در گزر ، عذرِ گناہم پذیر>

اس بند کے اشعار کے اخیر میں قافیہ اور ردیف کی جگہ حرف روی سے کام لیا گیا ہے اس روی کے الفاظ مستنیر ، ضریر ، پذیر کی آواز عمودی نہیں افقی ہے جو بات کرنے والے کی لجاجتِ طبع کو ظاہر کرتی ہے -

اب ہم اقبال کی دو کامیاب اور مشہور نظموں ''مسجد قرطبہ'' اور ''ساقی نامہ'' کو لیتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں - اس تجزیے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ اقبال کے یہاں موضوع اور ہیئت میں کس قدر گہرا ربط ہے -

''مسجدِ قرطبہ'' کا عنوان وہی حیثیت رکھتا ہے جو اقبال کے کلام میں دوسری نظموں مثلاً ''بلال'' ''کنارِ راوی'' یا ''موٹر'' کی ہے - شاعر نے اس نظم میں مسجدِ قرطبہ کی تاریخ بیان نہیں کی ، اس کے فنی اور تعمیری محاسن کا جائزہ نہیں لیا ، نظم ''صقلیہ'' کی طرح اس نے قدیم حجازی تہذیب کے مٹتے ہوئے آثار پر آنسو نہیں بہائے - یہ عنوان محض ایک شعری علامت ہے - ایک مرکزی نقطہ

۷- کلیاتِ اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۵۸ -

ہے جس کے گرد شاعر نے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کی ہے اور اپنے جذبات کی باز آفرینی دکھائی ہے ۔ یہ ایک کنایہ ہے جو اس کے شاعرانہ احساسات کی ترجمانی کرتا ہے ۔

''مسجدِ قرطبہ'' کی علامت میں تقدس کا پہلو پوشیدہ ہے ۔ وہ فنِ تعمیر کا ایک شاہکار بھی ہے اور عہدِ ماضی کی شاندار روایات کی ایک یاد گار بھی ۔ چنانچہ شاعر نے ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظم کے لیے ترکیب بند کی صنف انتخاب کی ہے ۔ ایک بند سے دوسرے بند تک پہنچنے کے لیے وہ بڑے سکون اور احترام سے چلتا ہے بحر کی طوالت شاعر کی ذہنی کیفیت کی آہستہ خرامی کو ظاہر کرتی ہے ۔ شاعر نے نظم کی ابتدا یوں کی ہے :

سلسلۂ روز و شب ، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب ، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب ، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب ، صیرفیٔ کائنات[۸]

یہ بحر مفتعلن فاعلن ، مفتعلن فاعلات ہے[۹] ۔ یہ اگرچہ نئی بحر نہیں تاہم اردو شاعری کی مروجہ اور متداول بحروں سے الگ تھلگ ضرور ہے ۔ یہ انتخاب شاعر کا غیر شعوری عمل نہیں ، ارادی اور اختیاری تصرف ہے ۔ اس لیے کہ اس بحر کی رفتار موضوع کی ثقاہت اور جذبات کے شدید مگر منضبط اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔

۸- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۸۵ ۔
۹- اس بحر کا نام ہے : منسرح مثمن مطوی موقوف مکسوف ۔

اس کے ارکان میں باہمی توازن ہے - ان اشعار میں ایک اندرونی ترنم پیدا ہو گیا ہے جو قافیے اور ردیف کے نہ ہونے کی تلافی کرتا ہے ، کیونکہ اس نظم کے اشعار میں قافیہ اور ردیف کی جگہ فقط روی کا استعمال ہوا ہے -

اس نظم میں عربی اور فارسی کے پُر شکوہ اور قدرے غیر مانوس الفاظ استعمال کیے گئے ہیں : مثلاً صیرفیٔ کائنات ، کاس ، الکرام ، ابن السبیل ، بادۂ رحیق ، ثغور ، تیغ اصیل ، شبوں کا گداز مگر ان لفظوں کی نشست شعروں میں اس طرح حسیں واقع ہوئی ہے جیسے کسی عظیم الشان عمارت میں بڑے بھاری پتھروں کے ٹکڑے لطیف انداز میں جڑے ہوتے ہیں اور اپنی عظمت کے ساتھ ساتھ شاہپارۂ فن میں لطافت پیدا کرتے ہیں - اس نظم کی اہم خصوصیت اس کا مترنم پن ہے - یہ ترنم آمیز لہجہ شروع سے اخیر تک چلا جاتا ہے - رستے میں مختلف النوع منزلیں آتی ہیں ، وقت کی رو ، بندۂ مومن ، نظریۂ فن ، اندلس کی فضائے حسیں میں عالمِ نو کے معرضِ وجود میں آنے کے امکانات - لیکن ساری نظم ایک خاموش قافلے کی طرح چلی جاتی ہے جس کے ہر راہی کا قدم ایک ہی نہج پر پڑتا ہے اور ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے - الفاظ کی اجنبیت اور ثقالت اس روانی میں حارج نہیں ہوتی ، اس لیے کہ وہ الفاظ معنوی اشارے نہیں بلکہ احساساتی محرکات ہیں جن سے جذبات خود بخود اُبھرتے چلے جاتے ہیں - چند شعر سنیے - شاعر مسجد سے خطاب کرتا ہے :

کعبۂ اربابِ فن ! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
آہ وہ مردانِ حق ! وہ عربی شہسوار
حاملِ خُلقِ عظیم ، صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے ، شاہی نہیں !

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط ، سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں[۱۰]

اس نظم کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس مسجد کے ساتھ ساتھ ایک اور مسجد فضا میں تعمیر ہو رہی ہے جس کی بنیادیں سنگ و خشت پر نہیں بلکہ انسان کے غیر فانی احساسات پر استوار کی گئی ہیں ۔

''ساقی نامہ'' اور ''مسجدِ قرطبہ'' دونوں نظموں کا بنیادی خیال ایک ہے ، لیکن موضوع الگ الگ ہے ۔ ''ساقی نامہ'' موضوع کے اعتبار سے ''مسجد قرطبہ'' کی ہم سخن ہے ، ہمنوا نہیں ۔ اس کی لَے اور ''مسجد قرطبہ'' کی لَے میں وہی فرق ہے جو خود ان لفظوں کے عنوانوں میں ہے ۔ ایک طرف ایک نظم کا موضوع تاریخ ، تقدیس اور فنون کا پس منظر پیش کرتا ہے اور دوسری طرف دوسرا موضوع خرابات اور طرب و انبساط کا پہلو لیے ہوئے ہے ۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے طرب و انبساط کی فضا میں اپنے متین خیالات کو اس طرح سمویا ہے کہ نظم کے نفسِ مضمون اور زبان و بیان میں مغایرت نہیں رہتی ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے شاعر نے بہت سے فنی وسائل استعمال کیے ہیں :

(۱) ہلکی پھلکی بحر جو بحر متقارب مثمن محذوف و مقصور ہے[۱۱] ۔

۱۰- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۹۰ ۔
۱۱- بحر کے ارکان ہیں : فعولن فعولن فعولن فعول ۔

(۲) مثنوی کی صنف جس سے اسلوبِ بیان کی سادگی بدستور قائم رہتی ہے اور کہیں ثقالت پیدا نہیں ہوتی ۔

(۳) روی اور قافیہ ردیف کا بدلتا ہوا امتزاج تاکہ مثنوی کے اشعار کی یکسانیت دور ہو سکے :

ہؤا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار !
گل و نرگس و سوسن و نسترن !
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن !
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں !

یا

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب !
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبّت میں یکتا ، حمیّت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا[۱۲]

دیکھیے شاعر نے روی اور ردیف کے متبادل تکرار سے نظم کے آتار چڑھاؤ کو کس طرح قائم رکھا ہے ۔

۱۲- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۱۲۲ ، ۱۲۴ ۔

اس نظم کی سادگی بیان کے ساتھ ساتھ اس میں اختصار و ایجاز بھی ہے - چند اشعار سنیے ، ہر شعر ایک نظم معلوم ہوتا ہے :

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں !

تمدن ، تصوّف ، شریعت کلام
بُتانِ عجم کے پجاری تمام !

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

مری فطرت آئینۂ روزگار !
غزالانِ افکار کا مرغزار !

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے !
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے !

ازل اس کے پیچھے ، ابد سامنے !
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے[۱۳]

باوجود اس کے کہ نظم کا مضمون جگہ جگہ پہلو بدلتا چلا جا رہا ہے ، نظم کی کیفیاتی ہم آہنگی میں کہیں فرق نہیں آتا - اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے اس طرح جذباتی طور پر پیوست ہیں کہ ساری نظم ایک کیفیاتی تجربہ بن گئی ہے - اس نظم میں شاعر الفاظ کی ترکیبات ، تشبیہات و استعارات ، تلمیحات اور علامات بھی

۱۳- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، صفحات بالترتیب ۴۱۴ ، ۴۱۶ ، ۴۱۵ ، ۴۱۷ ، ۴۱۹ -

موضوع کے مطابق لایا ہے :

کاروانِ بہار - دامنِ کوہسار - آشیاں - طیور - ساقیٔ لالہ فام - لذتِ شوق - گردشِ جام - خلوت و انجمن - غزالانِ افکار - مرغزار - انجمن آفرین و خلوت نشین -

پھر شاعر نے ہندی الفاظ کو فارسی الفاظ کے ساتھ لا کر ایک حسین لسانی توازن بھی پیدا کیا ہے تاکہ ساقی نامے کی فضا قائم رہے -

اقبال کے کلام میں نظموں کے علاوہ غزلوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود ہے - غزل کا ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے - اقبال جیسے فلسفی کے لیے ، جس کا دل و دماغ ایک منطقی کی طرح سوچتا ہے اور بیان میں تعین اور صراحت چاہتا ہے ، غزل کی صنف اور اس کا اسلوبِ بیان موزوں نہ تھا - لیکن اقبال نے اپنی غزلوں میں تغزل یعنی رمز و ایما اور علامات و تلمیحات کے استعمال کے ساتھ ساتھ غزل کے اشعار میں، جذباتی تسلسل پیدا کر کے اسے نظم کا رنگ دے دیا -

اس نے ان علامتوں اور تلمیحوں کی ، اپنی نئی بصیرتوں کی روشنی میں ، باز آفرینی کی ہے اور اس باز آفرینی سے شعری روایات کے مفہوم کو بدل دیا ہے - وہ ہر غزل میں بنیادی خیال کے مزاج کے مطابق بحر بھی تلاش کرتا ہے - یہاں صرف دو غزلوں کی مثالوں پر اکتفا کروں گا - پہلی غزل ہے :

جو تھا نہیں ہے ، جو ہے نہ ہوگا ، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ !
قریب تر ہے نمود جس کی ، اسی کا مشتاق ہے زمانہ !

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ[۱۴]

۱۴- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۴۲۱ -

اس غزل میں کیفیاتی تسلسل بہت مکمل ہے - یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اس غزل کا نظم کی طرح عنوان بھی رکھا ہے (''زمانہ'') - اس غزل کی بحر لمبی ہے جس میں بحر متقارت مثمن مقبوض اثلم کے آٹھ ارکان کو سولہ کر کے لکھا ہے : فعول فعلن ، ، فعول فعلن ، فعول فعلن ، فعول فعلن - دو مصرعوں کو ایک مصرع بنا دیا ہے - اس بحر کے استعمال سے شاعر نے وقت کے پھیلاؤ ، اس کے تواتر اور تسلسل اور اس طوالت کی کیفیت کا اظہار کیا ہے جو اس بحر کی موسیقیت سے خود بخود آشکار ہو جاتی ہے - قافیہ ردیف کی جگہ روی کو استعمال کیا ہے اور اس کی تلافی اندرونی ترنم سے کی ہے -

ہر شے مسافر ، ہر چیز راہی !
کیا چاند تارے ، کیا مرغ و ماہی !
تو مردِ میداں ، تو میر لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی !
دنیائے دُوں کی کب تک غلامی
یا راہبی کر ، یا پادشاہی !
پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز ! گفتار واہی !۱۵

اس غزل میں شاعر دنیا پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتا چلا جا رہا ہے - اس کا مشاہدہ تیزی کے ساتھ ہر لمحے ایک نیا پہلو بدلتا ہے - ان مختصر سے مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے اس غزل کے لیے چھوٹی بحر استعمال کی ہے تاکہ مشاہدوں کی تیزی نمایاں ہو جائے - اور پھر شعروں کے اخیر میں لمبے اور ڈھلکتے ہوئے قافیہ ردیف نہیں

۱۵- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۴۵ -

لایا تاکہ ان مختلف النوع مشاہدوں کا تواتر نہ ٹوٹ جائے اور ایک کے بعد دوسرا کیفیاتی تجربہ فوراً سامعین کے ذہن نشین ہو سکے۔

غرض اقبال کے کلام میں شعری تصورات، حسین افکار اور حسین اسلوب دونوں کا حسین امتزاج ہیں۔ اس کے نزدیک نظم کی ہیئت فقط بحر اور قافیہ ردیف ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں اندرونی ترنم، اسلوبِ بیان کا لہجہ، بنیادی خیال سے اس کی ہم آہنگی، سبھی کچھ شامل ہے۔

عورت اقبال کی نظر میں*

طالب آملی کا ایک شعر ہے ۔

زغارتِ چمنت بر بہار منت ھاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند[1]

بادی النظر میں پھول کو شاخ سے توڑنا گویا بہار کے جوبن کو لوٹ لینا ہے لیکن شاعر کہتا ہے جب کسی حسینہ کی نظر انتخاب کسی پھول پر پڑے اور وہ اسے چُن لے تو وہ غارت چمن نہیں بلکہ بہار پر ہزاروں احسان کر رہی ہے کیوں کہ پھول اس کے ہاتھ میں شاخ سے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے ۔

اب اس شعر کے پس منظر میں اقبال کی اس نظم کی طرف توجہ کیجیے جس کا عنوان ہے ''پھول کا تحفہ عطا ہونے پر'' اس نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے ۔

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
''الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے !
کلی سے رشکِ گل انتخاب مجھ کو کرے'' !

پھر شاعر پھول میں خطاب کر کے کہتا ہے :

---

* مطبوعہ ہفت روزہ لیل و نہار لاہور ، ۸ دسمبر ۱۹۶۳ء ، صفحات ۷ - ۸ -

۱- کلیات طالب آملی قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ص ۲۸-

تجھے وہ شاخ سے توڑیں ! زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے

اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا[۲]

اور اس کے بعد وہ اپنی ذات کو اس پھول کے مقابل لا کر لکھتا ہے :

مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہلِ نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر

کبھی یہ پھول ہم آغوش مدعا نہ ہوا
کسی کے دامن رنگیں سے آشنا نہ ہوا

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے[۳]

اس مختصر سی نظم میں اقبال نے حسن کی جاذبیت، عورت کی محبوبیت اور اس کے آغوش محبت میں مرد کی تکمیلِ حیات کی تصویر کے خط و خال دل پذیر انداز میں دکھائے ہیں ۔

یہ نظم اقبال کی ابتدائی نظموں میں سے ہے ۔ اس نظم میں عورت کا تصور محض جمالیاتی زاویۂ نگاہ تک محدود ہے لیکن یہ وہی زاویۂ نگاہ ہے جو پختگی افکار کے ساتھ اس کی بعد کی شاعری میں زیادہ قطعی اور واضح رنگ میں ہمارے سامنے آتا ہے ۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

---

۲ ، ۳- کلیات اقبال ، حصہ بانگ درا ، ص ۱۵۸ ۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں ! [۴]

لیکن تصویر کائنات میں رنگ بھرنے والی ہستی نے صرف شرار افلاطوں ہی کو جنم نہیں دیا ، اس شرار سے فقط افلاطوں کا فلسفہ و حکمت ہی وجود میں نہیں آیا بلکہ علوم و فنون کے کم و بیش تمام سرچشمے یہیں سے پھوٹتے رہے ہیں عصرِ حاضر کی جدید علمی اور نفسیاتی تحقیقات نے اسے ایک اٹل حقیقت تسلیم کر لیا ہے ، لیکن جہاں عورت کا وجود مرد کی زندگی کے نشو و ارتقا میں ایک حسین اور موثر محرک تھا وہاں مردوں نے اپنے فرضی تفوق کے زعم میں عورت کو ہمیشہ اپنی عیش کوشی اور عشرت پرستی کا ادنیٰ حربہ اور ذریعہ تصور کیا اور معاشرے میں اس کی حیثیت ایک زر خرید کنیز اور پرستار کی بن کر رہ گئی اقوام عالم کی تاریخ کے غائر مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کی تباہی ایسے حالات میں ہوئی جب عورت اپنا صحیح منصب کھو بیٹھی اور مرد کے قاہرانہ ہاتھوں میں آلۂ کار بن گئی -

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم ، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد [۵]

زندگی میں عورت کا صحیح منصب کیا ہے ؟ معاشرے میں عورت کا کون سا مقام ہونا چاہیے ؟ نسوانیت کسے کہتے ہیں ؟ اس

۴- کلیاتِ اقبال ، حصہ ضربِ کلیم ، ص ۵۵۶ -
۵- ایضاً ، صفحات ۵۵۷ ، ۵۵۸ -

کا جواب ہمیں قرآن کے اوراق اور رسول اکرامؐ کے اُسوۂ حسنہ میں مل جاتا ہے ۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو نہایت فخر و سر بلندی کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے معاشرے میں عورت کو وہ مقام عطا کیا جو اس سے پہلے اسے کبھی حاصل نہ ہوا تھا ۔ قرآن نے صرف اس بلند مقام کے تفویض پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے نام لیواؤں کے ذریعے اس کی عملی صورت بھی پیش کی اور ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جو اپنی عظمت ، استحکام اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے آئندہ نسلوں کے لیے سرچشمہ رہنمائی ثابت ہوا ۔

اقبال نے اپنی دو طویل نظموں اسرارِ خودی اور رموز بے خودی میں اس معاشرے کے خط و خال بڑے واضح انداز میں پیش کیے ہیں اور پھر افراد و علل کی زندگی پر حکیمانہ نظر ڈالتے ہوئے فرد و ملت کے باہمی ارتباط کی وضاحت کی ہے اور اسی ضمن میں امومت اور حفظ و احترام کا تذکرہ کیا ہے جسے اس نے اسلام کی بنیاد قرار دیا ہے ۔ ان تفصیلات کو سمجھنے کے لیے امومت کی غایت کیا ہے ۔ لازمی ہے کہ اقبالی نقطۂ نظر سے فرد اور ملت اور خودی اور بے خودی کا صحیح تصور ہمارے ذہن میں ہو ۔ میں چند غیر اصطلاحی ، سادہ اور مختصر الفاظ میں ان کا مفہوم پیش کرنے کی کوشش کروں گا ۔

اقبال کے نزدیک خودی سے مراد ایک بلند انسانی شخصیت کی تعمیر ہے ۔ شخصیت کی تعمیر کے لیے انسان کے سامنے ایک ایسا مطمح نظر ہونا چاہیے جو بلند سے بلند تر ہو ۔ انسانی زندگی عام حیوانات کی طرح صرف کھانے پینے اور سونے کا نام نہیں بلکہ اخلاقی اور تہذیبی فضائل کا اکتساب ہے ۔ ایسے بلند اور اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے انسان کو ہمیشہ سرگرم سعی و عمل رہنا چاہیے اور ایک منزل کا سراغ پانے کے بعد دوسری منزل کی طرف رواں دواں

چلنا چاہیے اس پیہم جستجو ، اس مسلسل تگ و دو کے لیے ایک بے قرار جذبہ ، ایک سکون ناپذیر خلش ، ایک نہ مٹنے والی تڑپ درکار ہے جسے اقبال عشق کے نام سے تعبیر کرتا ہے ایسی ہی شخصیت کی تعمیر سے ایک فرد کامل بنتا ہے اور ایسے پختہ کار افراد کے اجتماع سے ایک مستحکم معاشرہ وجود میں آتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جہاں کسی معیاری اور نصب العینی معاشرے کا وجود بغیر معیاری افراد کے ممکن نہیں وہاں کسی معیاری فرد کی تکمیل کا تصور بھی بغیر ایسے معاشرے کے ذہن میں نہیں آ سکتا ۔

خودی اور بے خودی کا ظاہری تضاد ایک الجھاؤ پیدا کرتا ہے لیکن جب کوئی فرد معاشرے کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے تو اس کی خودی اپنے مقام سے گزر کر بے خودی کے مقام پر پہنچ جاتی ہے اور اس طرح اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی یا نقص واقع نہیں ہوتا ۔

اقبال نے اخوت و مساوات کے تحت دو داستانیں بیان کی ہیں جن سے خودی اور بے خودی کا ایک متوازن امتزاج ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔

ایران میں یزد جرد کی فوجیں مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں ۔ ایک مسلمان سپاہی ایرانی افواج کے ایک سپاہی کو مغلوب کر لیتا ہے ۔ وہ ایرانی سپاہی مسلمانوں کی وسعت قلبی کا واسطہ دے کر اس سے اپنی جاں بخشی کرا لیتا ہے ۔ جب ایرانی شکست کھا چکتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ مغلوب سپاہی ایرانی افواج کا سپہ سالار جابان ہے ۔ سب اس کے قتل کے خواہاں ہوتے ہیں ۔ مسلمان سپاہی اپنے وعدہ کا تذکرہ کرتا ہے اور اس تذکرے کو سن کر فوج حجاز کا سالار ابو عبیدؓ اسے یہ کہہ کر چھوڑ دیتا ہے کہ ہم اس کا خون نہیں بہا سکتے کیونکہ ایک مسلمان نے اسے پناہ دی ہے ۔

گفت اے یاراں مسلمانیم ما
تار چنگیم و یک آہنگیم ما

نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلق بلالؓ و قنبرؓ است

ہر یکے از ما امینِ ملت است
صلح و کینش صلح و کینِ ملت است

ملت ارگردد اساسِ جانِ فرد
عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد

گرچہ جاباں دشمنِ ما بودہ است
مسلمے اورا اماں بخشودہ است

خونِ او اے معشر خیرؐ الانام
بردمِ تیغِ مسلماناں حرام[۶]

یہاں قانون ، شریعت یا معاشرہ ایک فرد کے آگے جھک رہا ہے۔ دوسری داستان یوں ہے۔

ایک بادشاہ ایک معمار یعنی انجینیئر کو ایک مسجد بنانے کا حکم دیتا ہے۔ مسجد تیار ہوتی ہے لیکن بادشاہ اسے پسند نہیں کرتا اور غصے کے عالم میں اس کے ہاتھ کٹوا دیتا ہے۔ مظلوم معمار فریاد لے کر قاضی کے حضور پہنچتا ہے۔ قاضی اس کی فریاد کو سن کر بادشاہ کو طلب کرتا ہے۔ آیۂ قصاص کو پڑھ کر یوں فیصلہ صادر کرتا ہے۔

گفت قاضی فی القصاص آمد حیٰوۃ
زندگی گیرد یایں قانوں ثبات

۶۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۰۶۔

عبد مسلم کمتر از احرار نیست
خون شہ رنگیں تر از معمار نیست[۷]

بادشاہ اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیتا ہے ۔ مدعی بے تاب ہو کر آیۂ بالعدل والاحسان پڑھتا اور کہتا ہے ۔

گفت از بہر خدا بخشید مش
از برائے مصطفٰیؐ بخشید مش

اقبال اس واقعہ پر یوں تبصرہ کرتا ہے ۔

پیشِ قرآن بندہ و مولا یکی است
بوریا و مسندِ دیبا یکی است[۸]

یہاں ایک فرد ، جماعت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور اس طرح اس خودی بے خودی کے مقام پر قدم رکھتی ہے ۔

اسلام نے ایسے ہی افراد کو پیدا کیا اور ایسے ہی افراد سے ایک منظم اور مستحکم معاشرے کی تشکیل کی اور اقبال ایسے ہی معاشرے کی باز آفرینی کا طلب گار ہے ۔

صحت مند ، توانا اور قوی افراد کی تربیت کے لیے ایک تنو مند معاشرے کی ضرورت ہے لیکن پیشتر اس کے کوئی فرد اس تربیت گاہ میں قدم رکھے اس فرد کی تخلیق کے لیے ایک ماں کا وجود ملت کی عظیم الشان عمارت کے لیے سنگِ بنیاد کا کام دیتا ہے اور یہ خشت اول اگر درست ہو تو عمارت کی دیواریں ، منڈیریں ، محرابیں اور کنگرے درست ہوں گے ۔

اقبال ماں کے وجود کو ایک رحمت قرار دیتا ہے اور کہتا

---

۷ ، ۸ ۔ کلیات اقبال حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۰۸ ۔

ہے کہ اسے نبوّت سے ایک خاص نسبت ہے ۔ اس کی شفقت میں شفقت پیغمبری پوشیدہ ہوتی ہے ۔ وہ بھی نبی کی طرح اقوام کی صورت گری کرتی ہے ۔ انھیں بناتی سنوارتی اور استحکام بخشتی ہے ۔ ہماری تعمیر اسی سے پختہ تر ہوتی ہے ۔ اس کی پیشانی کی شکن اور خطوط ہماری تقدیر کے خدو خال ہوتے ہیں ۔ اگر انسانی ذہن معنی رس ہو تو امومت اور اُمت کے لفظوں میں جو مناسبت ہے ۔ اس میں بڑے نکتے پوشیدہ ہیں ۔ ہر چند کہ

نغمہ خیز از زخمہ زن سازِ مرد　　از نیازِ او دوبالا نازِ مرد
پوششِ عریانیٔ مرداں زن است　　حسن دلجو عشق را پیراہن است[۹]

لیکن عورت کی زندگی کا اصل منصب تخلیق ہے اور اسی میں اس کی عظمت پوشیدہ ہے یہی اس کا اصلی حسن ہے ۔ اقبال کے نزدیک ایک دیہاتی لڑکی کی پست قد ، موٹی بد شکل ، گنوار ، کم نگاہ کم زبان سادہ ، گھریلو غموں میں اُلجھی ہوئی ہے ۔ غم نے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ڈال دیے ہیں لیکن وہ ایک سعادت مند بچے کو جنم دیتی ہے وہی عورت قوم کی بہترین فرد ہے اور ایسی ہی عورت اسلامی معاشرے کا ستون ہے ۔

آں دخِ رستاق زادے جاہلی　　پست بالائے سطبرے بدگلی
ناتراشے پرورش نا دادۂ　　کم نگاہی کم زبانی ، سادۂ
دل ز آلام امومت کردہ خوں　　گردِ چشمش حلقہ ہای نیلگوں
ہستی ما محکم از آلامِ اوست　　صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست[۱۰]

---

۹ ، ۱۰ - کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ص ۱۴۹ ، ۱۵۰ -

سرود انجم*

اقبال اپنی کتاب ''پیامِ مشرق'' کے دیباچے میں ایک جگہ لکھتا ہے :

''پیامِ مشرق'' کے متعلق جو ''مغربی دیوان'' سے سو سال بعد لکھا گیا ہے ۔ مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر آن اخلاق ، مذہبی اور ملّی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے ۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم

---

* یہ مقالہ یوم اقبال کراچی ۱۹۶۶ء منعقدہ اقبال کونسل کے تحت پڑھا گیا ۔ کونسل مذکور نے اس تقریب کے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا ۔ زیر نظر مقالہ ، مقالات یوم اقبال کراچی ۱۹۶۶ء مولفہ یعقوب توفیق صفحات ۴۴ - ۴۹ میں شائع ہوا ۔ نقوش اقبال نمبر ، نومبر ۱۹۷۷ء (۳۰۵ - ۳۱۳) میں کسی قدر اضافے کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا اور اسی صورت میں پیشِ خدمت ہے ۔ مقالات یوم اقبال کے مؤلف اس مقالے کے بارے میں رقم طراز ہیں ۔ ''صوفی تبسم صاحب نے اپنے مقالے میں علامہ اقبال کے فنی کمالات پر روشنی ڈالی ہے ۔ اس کے لیے انھوں نے علامہ کی ایک خراماں اور مترنم نظم کا انتخاب کیا ہے ۔ یہ آن کے حسنِ انتخاب کی دلیل ہے جس طرح نظم ایک متناسب و مربوط حسن ہے اسی طرح اس پر لکھا ہوا مقالہ بھی انہی صفات سے متصف ہے'' ۔ (مقالات یوم اقبال ، ص ذ) ۔

محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے - یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے ، فطرت ، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے - یورپ نے اپنے علمی ، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں - - - لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین ، اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے -

خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگ عظیم کی کوفت کے بعد ، یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ، ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لیے نامساعد ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پردۂ فرسودہ ، سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت ، غالب نہ آ جائے جو جذبات قلب کو افکار و دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی البتہ امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک ، قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے -

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو ، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب

تک اس کا وجود، پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون، جس کو قرآن نے ''ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر و اما بانفسہم''[1] کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ایسی کوشش، جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابلِ احترام ہے[2]۔

اقبال نے ان چند سطروں میں پہلی جنگِ عظیم کو قیامت کے موزوں لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایسی قیامت جس نے پرانی دنیا کے نظام کو درہم برہم کر دیا اور ایک ایسی بنیاد رکھی کہ اس میں ایک نئے آدم کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیائے فکر و عمل تعمیر ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے بعض بہت بصیرت افروز اشارے بھی کیے ہیں جن سے اس کے فلسفیانہ افکار کا سراغ ملتا ہے۔

''پیامِ مشرق'' پہلی بار ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۵ء میں اور اس کے فوراً بعد ''رموز بیخودی'' بھی مطبوعہ صورت میں قارئین کے سامنے آ چکی تھی۔ اردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ بانگِ درا ۱۹۲۴ء میں چھپا۔

اقبال نے اسرار خودی میں حیاتِ افراد کے تعین عمل پر بحث کی اور اُن کی فردی انا کے اساس اور تدریجی نشوونما پر روشنی

۱- القرآن پ ۱۳، سورہ الرعد۔
۲- کلیاتِ اقبال، حصہ اسرار و رموز، ص ۱۱ - ۱۳ -

ڈالی اور اسی ضمن میں اجتماعی یا قومی انا کے بارے میں ''رموزِ بیخودی'' میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تا کہ انفرادی اور اجتماعی عمل کا تباین اور تناقص دور ہو سکے جو ملی زندگی میں ایک قلب مشترک کا کام دے سکے۔

ان دو کتابوں میں مصنف نے اپنے افکار کو نظریاتی انداز میں پیش کیا لیکن پیامِ مشرق کے طبع ہونے کے بعد، یہی نظریاتی مسائل، مختلف نظموں کے روپ میں ہمارے سامنے آ گئے۔ اقبال کا یہ مجموعۂ کلام ایک محدود دور کی پیداوار ہے اور مخصوص حالات و ضروریات کے ماتحت ظہور میں آیا۔ اس مجموعے کی بعض نظمیں ایک طرف، اُس عہد کی رفتار واقعات کی آئینہ داری کرتی ہیں اور دوسری طرف شاعر کے فطری رجحان، نظام فکر، اور اسلوب بیان کی واضح تصاویر ہیں۔ مثلاً تسخیر فطرت، کرمک شب تاب، زندگی اور سرود انجم وغیرہ۔

اگرچہ افکار شعری کے اعتبار سے ''تسخیر فطرت'' کی نظم کو سب پر فوقیت حاصل ہے لیکن میں نے ''سرود انجم'' کی چھوٹی سی نظم کا اس لیے انتخاب کیا ہے کہ:

۱- یہ نظم اس دورِ انقلاب کی بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ ترجمانی کرتی ہے۔

۲- یہ نظم فکری اعتبار سے آفاقیت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

۳- اس نظم سے شاعر کے بعض لسانی اور عروضی اجتہادات کا سراغ ملتا ہے۔

۴- اس نظم میں شاعر نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے اور انداز تغزل کو بڑی فنکارانہ ہنر مندی کے ساتھ قالب نظم میں سمویا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نظم غزل و نظم کے امتزاج کا ایک حسین مرقع بھی ہے۔

۵- اس نظم میں موسیقیت اور غنائی توانائی ، اپنی پوری قوت اور دلکشی اور جذب و کشش کے ساتھ موجود ہے ۔

٦- اس نظم کی زبان سادہ ، مگر بلیغ ہے اور باوجود انتہائی ایمائی اسلوب کے ، پڑھنے والے کو اپنی گہرائیوں کی کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے ۔

سب سے پہلے اس نظم کو سن لیجیے ۔

سرودِ انجم

ہستیٔ ما نظامِ ما مستیٔ ما خرامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما زندگیٔ دوامِ ما
دور فلک بکامِ ما می نگریم و می رویم

جلوہ گہ شہود را بتکدۂ نمود را
رزم نبود و بود را کش مکش وجود را
عالم دیر و زود را می نگریم و می رویم

گرمیٔ کارزار ہا خامیٔ پختہ کار ہا
تاج و سریر و دار ہا خواریٔ شہر یار ہا
بازیٔ روزگار ہا می نگریم و می رویم

خواجہ ز سروری گزشت بندہ ز چاکری گزشت
زاری و قیصری گزشت دورِ سکندری گزشت
شیوۂ بت گری گزشت می نگریم و می رویم

خاکِ خموش و درخروش سست نہاد و سخت کوش
گاہ بہ بزم ناؤ نوش گاہ جنازۂ بہ دوش
میر جہان سفتہ گوش می نگریم و می رویم

توبہ طلسمِ چون و چند　　عقل تو در کشاد و بند
مثلِ غزالہ در کمند　　زار و زبون و دردمند
ما بہ نشیمن بلند می نگریم و می رویم

پردہ چرا، ظہور چیست؟　　اصل ظلام و نور چیست؟
چشم ودل وشعور چیست؟　　فطرت ناصبور چیست ؟
ایں ہمہ نزد و دور چیست؟ می نگریم و می رویم

بیشِ تو نزدِ ما کمی　　سالِ تو پیشِ ما دمی
اے بکنارِ تو یمی　　ساختہ بہ شبنمی
ما بتلاشِ عالمی می نگریم و می رویم[۳]

اقبال میں جدت کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا ۔ لیکن اُس کی اردو اور فارسی نظموں اور غزلوں کا ڈھانچہ بالعموم کلاسیکی ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اپنی شاعری میں نئے نئے عروضی تجربات کر سکتا تھا لیکن اس کی توجہ زیادہ تر افکار پر مرکوز رہی ، اس کے باوجود اس نے اردو اور فارسی میں بعض ایسی تبدیلیاں کیں جنہوں نے ہماری شاعری کا رخ بدل دیا ۔

اقبال نے پرانی روایتی مصطلحات شعری کو نیا مفہوم عطا کیا جس کی پہلی مثال ہمیں اس کی ایک ابتدائی غزل کے اس مطلعے سے ملتی ہے :

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی[۴]

اقبال نے اپنے کلام میں موضوع اور ہیئت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی ۔ بال جبریل کی دو نظمیں ''ساقی نامہ'' اور ''قرطبہ'' اور

۳۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۶۸ - ۲۷۰ -
۴۔ کلیات اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۲۷۸ -

فارسی میں ''کرمک شب تاب'' اور ''سرود انجم'' اس کی بہترین مثالیں ہیں ۔

اب آئیے ذرا اس نظم زیرِ بحث کے پہلوؤں پر ایک غائر نظر ڈالیں ۔

شاعر سب سے پہلے اپنے پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو ارضی حدود سے بالاتر کھینچ کر ، ایک لامحدود ، آفاقی فضا میں لے جاتا ہے اور ستاروں سے روشناس کراتا ہے جو ایک لا انتہا کشادہ وسعتوں میں ، گھوم رہے ہیں ۔ اور دنیا کے ہر طرح کے مخمصوں اور مادی زندگی کی تمام فکر مندیوں اور خرخشوں سے آزاد ، اپنی پوری شانِ استغنأ کے ساتھ ۔ محو خرام ہیں اور بڑی تمکنت کے انداز میں فضا میں گنگناتے چلے جا رہے ہیں اور ہم فانی انسانوں کی فانی زندگی پر خندہ زن ، بلکہ طعنہ زن ہیں ۔

اس نظم کے آٹھ بند ہیں ۔ پہلا بند دیکھیے :

ہستی ما نظام ما مستیٔ ما خرام ما
گردش بے مقام ما زندگی دوام ما
دور فلک بکام ما می نگریم و می رویم[۵]

اس بند میں ستارے اپنا تعارف کراتے ہیں اُن کی ہستی کی بنیاد نظامِ فلکی پر ہے ۔ جب تک وہ نظام قائم ہے وہ بھی قائم و دائم ہیں ۔

زندگی میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے انسانی زندگی میں کبھی ہیجان موجزن ہوتا ہے کبھی اس دھارے میں افسردگی اور پست روی آ جاتی ہے ۔ ستاروں کی ہر حرکت جسے شاعر نے خرام کہا ہے سر تا پا مستی ہے ۔ اس میں کبھی خمار کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ۔

۵- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۶۸ ۔

ستاروں کا سفرِ حیات کسی منزل پر نہیں رُکتا ، اسی گردشِ بے مقام نے اُن کی زندگی کو دوام عطا کیا ہے ۔

زمین والے گردشِ فلک سے سہمے رہتے ہیں ۔ ستارے اس سے بے فکر ہیں ۔ یہاں تو دور فلک سازگار ہے بلکہ خود ان کا ہم سفر اور ہم قدم ہے ۔

اب اس عالم بے نیازی و بے فکری میں اُن کے لیے سوائے اس کے اور کوئی کام نہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے چلے جائیں اور آگے نکل جائیں ۔ اس گردوپیش میں ان کی نظر اس کائنات پر پڑتی ہے جو نہ جانے کیا ہے ؟ کہاں سے منصۂ شہود پر آ گئی ہے لیکن ایک حسین بت کدہ بن کر ہمارے رو برو آئی ہے ۔ شاعر نے اسے بت کدہ نمود کہا ، کہ اگر حسین ہے لیکن نمود ہے ۔ نہ جانے اس کے پیچھے کیا ہے ۔ یہ دنیا ، ہست و نیست کی رزم گاہ ہے ۔ جہاں بقا و فنا کی کشمکش پوری توانائی کے ساتھ جاری ہے ۔ ایک شے مٹتی ہے تو دوسری اُبھر آتی ہے پھر کوئی جلدی اُبھرتی ہے کوئی دیر میں ، کوئی آج کوئی کل ۔ لیکن ابدیت کے آغوش میں کھیلنے والے ستاروں کو اس سے کیا غرض ، وہ تو ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں اور گزر جاتے ہیں ۔

اب اسے ذرا شاعر کے زاویے سے اس منظر پر نظر ڈالیئے :

جلوہ گہِ شہود را　　بت کدۂ نمود را
رزم نبود و بود را　　کشمکش وجود را
عالمِ دیر و زود را　　می نگریم و می رویم

''غزلیہ'' اسلوب بیان میں انتہائی اختصار کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے شاعر کو رمز و ایما سے کام لینا پڑتا ہے ۔ نظم میں منطقیانہ ترتیب اور وضاحت و صراحت کی گنجائش ہوتی ہے لیکن غزل کی ساخت اس منطقی تسلسل اور طول صراحت کی متحمل نہیں ہو سکتی

اقبال نے اپنی اس نظم میں نظمیہ اور غزلیہ اسلوب بیان میں نہایت حسین و بلیغ امتزاج پیدا کیا ہے خاص کر یہ بند :

گرمیِ کار زار ہا　　خامیٔ پختہ کار ہا
تاج و سریرو دار ہا　　خواریٔ شہر یار ہا
بازی روزگار ہا　　می نگریم و می رویم[۶]

ذرا دیکھیے شاعر نے کس فنکارانہ مہارت سے چند لفظوں میں جنگ کی ہولناکیوں اور اس کے عبرت ناک نتائج کی تصویر ہمارے سامنے لا کر کھڑی کر دی ہے۔

گرمی کار زار ہا کے دو لفظوں میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے ۔گرمی کے لفظ میں کتنی سرگرمیاں ، کتنے ہنگامے جلوہ فرما ہیں اور کار زار ہا میں کتنی تباہ کاریوں کا انبوہ ہے ۔

یہ جنگیں کون کراتا ہے ۔ آپ اور میں نہیں ۔ یہ بڑے بڑے تجربہ کار اور پختہ کار ذہنوں کی کاوش اور فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن اس پختگیِ فکر میں بڑی خامی ہوتی ہے ۔ ایسی لغزش کہ ایک دانا ہی سے سَر زد ہوتی ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ وہ لغزش بھی بڑی خطرناک ہوتی ہے ۔ پھر ان جنگی تباہ کاریوں کے نتائج کیا ہوتے ہیں شاعر نے دو چار لفظوں میں بیان کر دیے:

تاج و سریر و دار ہا　　خواریٔ شہر یار ہا[۷]

پہلی عالمی جنگ میں بڑی بڑی سلطنتیں تہ و بالا ہو گئیں ۔ تخت و تاج لٹ گئے ۔ جلیل القدر شہنشاہ رسوا اور ذلیل ہوئے ۔ جو سر کبھی جھکتے نہ تھے ، دار پر آویزاں ہو گئے ۔

۶۔ کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۶۸ - ۲۶۹ ۔
۷۔ ایضاً ، ص ایضاً ۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن قدرت کی نظر میں ایسے تھا جیسے کوئی بچہ اپنے کھلونوں سے کھیلتا ہوا انھیں نہایت بے پرواہ انداز میں بے تکلیف توڑ کر رکھ دے ۔

قدرت کی ستم ظریفیاں ! شاعر نے انھیں ''بازی روز گار ہا'' جمع کے صیغے میں بیان کیا ۔

ستارے یہ بھی دیکھتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے جاتے ہیں :

خواجہ ز سروری گزشت　　بندہ ز چاکری گزشت
زاری و قیصری گزشت　　دور سکندری گزشت
شیوہ بت گری گزشت می نگریم و می رویم[۸]

دنیا میں آمریت کی جگہ جمہوری نظامِ حکومت نے لے لی ۔ آقا آقا نہ رہا غلام غلام نہ رہا ۔

زار اور قیصر جیسے باجبروت اور قاہر فرمانرواؤں کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا ۔ دور سکندری ختم ہوا ۔ فتح عالم کے محض شوق میں دنیا کو تہ و بالا کرنے کے ناجائز حقوق سلب کر لیے گئے ۔

زار و قصیر و سکندر کیا تھے ؟

یہ وہ بت تھے جو دنیا والوں نے اپنی بے بسی اور بیچارگی کے دکھوں کو چھپانے اور ایک چھوٹی سی تسکین حاصل کرنے کے لیے تراشے تھے ان بتوں کو یکسر توڑ دیا گیا ۔ یہ بت گری تھی ، اس بت گری کی رسم مٹ گئی اور انسانیت کا سر پھر ایک بار بلند ہوا ۔

۸- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۶۹ ۔

اقبال اس کے بعد کے دو بندوں میں ستاروں کی زبان سے انسانی زندگی کی تصویر یوں پیش کرتا ہے :

خاک خموش و در خروش سست نہاد و سخت کوش
گاہ بہ بزم ناؤ نوش گاہ جنازۂ بدوش
میر جہان و سفتہ گوش ! می نگریم و می رویم[۹]

انسان ایک مشتِ خاک ہے لیکن ولولوں کے ہنگامے سے پُرخروش ، فانی ، ذرا سی ٹھیس سے ختم ہو جانے والا ، لیکن انتہائی جفا کش ، کبھی محفل نشاط میں رونق افروز ، کبھی لاش اٹھائے ہوئے شہر خموشاں کو رواں - کہیں آقا ہے کہیں غلام

یہ ہے انسان - پھر اس کی اور بیچارگی دیکھیے :

تو بہ طلسمِ چون و چند عقل تو در کشاد و بند
مثل غزالہ در کمند زار و زبون و درد مند
مابہ نشیمن بلند می نگریم و می رویم[۱۰]

انسان جبر و اختیار کے مابین گرفتار ہے - حقائق اشیاء پر غور کرتا ہے تو منطقی استدلال کی زنجیروں میں الجھ کر رہ جاتا ہے - فکرِ انسانی کیا ہے ؟ اس غزال کی طرح ہے جو کمند میں اسیر ہو اور اس کی آزادی کا دائرہ کمند کی درازی تک محدود ہو -

ستارے انسان کی اس بیچارگی کو دیکھتے ہیں اور اس کے احسن تقویم اور مسجود ملائک ہوتے ہوئے اس کی بے بسی پر اظہار

۹- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۶۹ ، ۲۷۰ -
۱۰- ایضاً ، ص ۲۷۰ -

تاسف کرتے ہیں اور پھر اپنی عظمت کا اظہار کس تمکنت سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں : ما بہ نشیمن بلند

اے انسان ! تو کس جگہ ہے - ہمیں دیکھ ، ہم کتنی بلند سطح پر ہیں - کتنی آزادی اور آسودگی کے ساتھ تیری بے بسی کو دیکھتے ہیں اور پھر بڑی بے نیازی سے گزر جاتے ہیں -

''ما بہ نشیمن بلند'' میں جو طنز پوشیدہ ہے وہ اصحاب نظر سے پوشیدہ نہیں -

اس نظم سے شاعر کا مقصد اپنے قارئین کو محض ستاروں کا نغمہ سنانا نہیں ہے - چنانچہ وہ گریز کرتا ہے اور اصلی مقصد کی طرف آتا ہے - اور پھر بڑی فکری بلاغت اور فنی چابکدستی سے ستاروں سے ہم آہنگ ہو کر ایک گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے یہ کائنات کیا ہے ؟ اس کی اصل حقیقت کیا ہے ؟ کچھ چیزیں آشکار ہیں کچھ نہاں ، جو نہاں ہیں وہ کیوں ہیں ؟ جو آشکار ہیں ان کی غایت کیا ہے؟ یہ اندھیرا اور اجالا کیسا ! جب یہ عالم ہے تو پھر انسان کو آنکھیں کیوں عطا ہوئیں ، دل کیوں ملا ، احساس کیوں دیا گیا ؟ جن کا نتیجہ کچھ نہیں - پھر ستم یہ کہ انسانی تلاش حقیقت کے لیے بدستور بے قرار ہے آخر کیوں ؟ یہ دور اور نزدیک کے تفرقے تو چلے جاتے ہیں -

پردہ چرا ظہور چیست ؟ اصلِ ظلام و نور چیست ؟
چشم و دل و شعور چیست ؟ فطرتِ نا صبور چیست ؟
این ہمہ نزد و دور چیست ؟ می نگریم و می رویم[11]

۱۱- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۷۰ -

یہیں پہ آ کے اقبال انسان کے بارے میں اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ کی طرف اشارہ کر جاتا ہے کہ انسان نے جب سے آنکھ کھولی ہے وہ حقیقت عالم کے معلوم کرنے کے لیے محو جستجو ہے ۔ حقیقت آشکار ہو نہ ہو ، فطرت کا منشاء اسے سرگرم جستجو رکھتا ہے کیونکہ یہی اس کی زندگی ہے ۔ سفر حیات کی کوئی منزل نہیں ۔ انسانی زندگی ایک سفر ہے اور سفر ہی اس کی منزل بھی ہے ۔

اب ذرا آخری بند کی طرف آئیے :

اخیر میں ستارے اپنی زندگی اور انسانی زندگی کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

بیشِ تو نزدِ ما کمے سالِ تو پیش مادمے
اے بکنارِ تو یمے ساختہ بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے می نگریم و می رویم [۱۲]

اے انسان ! جسے تو زیادہ سمجھتا ہے وہ ہمارے نزدیک کم ہے (بہت کم)

جسے تو سال کہتا ہے وہ ہمارے لیے ایک لمحہ ہے (ایک حقیر لمحہ)

اے انسان ! تیرے سینے میں ایک سمندر ہے (ایک وسیع سمندر)

پھر تو ایک قطرۂ شبنم (ایک حقیر قطرۂ شبنم) پر کیوں قناعت کر گیا ہے ؟

ہماری طرف دیکھ کہ ہماری زندگی ابدی ہے لیکن اس کے باوجود ہم ایک اور عالم کی تلاش میں ہیں (ایک عظیم عالم کی)

۱۲- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۲۷۰ ۔

ایک، وسیع تر دنیا کی۔

میں نے اس بند کے ترجمے میں چند الفاظ بتکرار استعمال کیے ہیں بہت کم ، ایک حقیر لمحہ ، ایک وسیع سمندر ، ایک حقیر قطرۂ شبنم ، ایک عظیم عالم ۔

اس کی تفصیل سنیے ۔ اس میں آپ کو شاعر کے شاعرانہ کمال کا سراغ ملے گا۔

فارسی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ''حروف الفاظ کے ساتھ پیوست ہوکر 'الفاظ میں معنوی وسعت پیدا کرتے ہیں ۔ اس بند میں شاعر نے ''ے'' کو استعمال کیا ہے ۔

صرف و نحو میں ''ی'' بالعموم ایک کا مفہوم دیتی ہے جیسے کتابے (ایک کتاب) ۔ اس بند میں ''ے'' کہیں تحقیری ہے کہیں تعظیمی۔ ''کے'' ، ''دمے'' اور ''شبنمے'' کے الفاظ میں تحقیری اور ''یمے'' اور ''عالمے'' کے لفظوں میں تعظیمی ۔

اقبال کا ایک شعر ہے :

نہ زباں کوئی غزل کی ، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو ، عجمی ہو یا کہ تازی ![۱۳]

غزل کی کوئی خاص زبان نہیں اور نہ غزل سے کوئی شخص شاعر بنتا ہے ۔

شاعر ہی زبان کو سنوارتا اور غزل یا شعر کو جنم دیتا ہے اس کے لیے ایک صدائے دلکشا کی ضرورت ہوتی ہے ۔

ہر بڑا شاعر جس زبان میں شعر کہتا ہے اسے توانائی اور قوت بخشتا ہے اور اسے عظیم بنا دیتا ہے ۔ اقبال لاکھ کہے کہ میں ایک

۱۳- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۰۹ ۔

پیغام لے کے آیا ہوں شاعر نہیں ہوں لیکن اُس نے اپنی شاعری سے اردو اور فارسی زبان کو ایک نیا مقام عطا کیا ہے جس کی ایک ادنیٰ مثال آج کی نظم ''سرود انجم'' ہے۔

اس نظم کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ستاروں کا یہ نغمہ اب بھی فضا میں اسی طرح گونج رہا ہے اور حقائق حیات کا اعلان کر رہا ہے۔

آردو شاعری میں قومی تحریک اور اقبال*

پرانی آردو شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی قومی تحریک کی جھلک دکھائی نہیں دیتی ۔ یہ اعتراض پاک و ہند کے برصغیر کی تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا ۔ شعر میں کوئی چیز اسی وقت نمودار ہوتی ہے جب اس چیز کا کوئی حقیقی یا ذہنی اور خیالی وجود ہو ۔ جب قومی تحریک موجود ہی نہ تھی تو شعر و ادب اس سے کیوں کر متاثر ہو سکتے تھے ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ، ہماری ہر سماجی ، مذہبی اور سیاسی تحریک ، قومی نہیں بلکہ شخصی سطح تک محدود تھی ۔ قوم کے سامنے کوئی ایسا اجتماعی تصور نہیں تھا جو اسے حرکت میں لا سکتا ۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ، وہابی تحریک اور حضرت سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد نے مسلمانوں کی زندگی میں یک گونہ حرکت پیدا کی ، لیکن ان تحریکوں کا اثر اور اس کا پھیلاؤ وسیع اور مستقل اور دیرپا نہیں تھا ان تحریکوں کے ہلکے اور دھندلے اثرات مرزا غالب اور حکیم مومن خاں مومن کی بعض فارسی مثنویوں میں

---

* یہ مقالہ یوم اقبال ۱۹۶۷ء منعقدہ اقبال کونسل کراچی میں پڑھا گیا بعد میں اس تقریب کے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ۔ زیر نظر مقالہ' مقالات یوم اقبال ۱۹۶۷ء مرتبہ یعقوب توفیق شائع کردہ اقبال کونسل ۱۰۳ ریسٹ کیمپ روڈ کراچی (۱۹۶۸ء) کے صفحات ۶۰ - ۶۴ میں طبع ہوا ۔

دکھائی دیتے ہیں ۔ ان اثرات کو انہی تحریکات کی صدائے بازگشت کہا جا سکتا ہے ۔

۱۸۵۷ ء کا واقعہ اگرچہ ایک بہت بڑا ملکی اور قومی حادثہ تھا ۔ اس کا اثر ابتدا میں محدود انداز میں رونما ہوا اور شہر دہلی کی تباہی اور بعض عظیم خاندانوں اور شخصیتوں کی زبوں حالی کا نوحہ بن کر رہ گیا ۔ لیکن جب اس حادثے کے اثرات واضح ہوئے اور بقول اقبال :

"ملک ہاتھوں سے گیا ، ملت کی آنکھیں کھل گئیں"
سرمہ چشم دشت میں گرد رم آہو ہوا[1]

اس ہنگامے سے اٹھے ہوئے گرد و غبار کے طوفانی بادل چھٹ گئے تو دھندلائی ہوئی آنکھوں کو سرمۂ بصیرت ملا اور ان کے دل لرزنے لگے اور گرد کے ذرات کی جگہ آنسوؤں نے لے لی ۔ ایک ماتم بپا ہوا ۔ یہ ہماری قومی شاعری کی صحیح ابتدا تھی ۔ ہماری اردو قومی شاعری نے پہلا پلٹہ کھایا ۔ یہ اس کا پہلا دور تھا ، جسے "ماتم" کے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔

قومی شاعری کے اس دور میں سب سے ممتاز نام مولانا حالی کا ہے ، جن کی طویل نظم "مد و جزر اسلام" نہ صرف قومی احیاء میں بلکہ جدید اردو ادب کی تاریخ میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ،

۱۔ بانگ درا ص ۳۰۱ (یہ شعر نظم شمع و شاعر میں درج تھا جسے اقبال نے نظر ثانی کے وقت قلم زد کر دیا (دیکھیے مطالب بانگ درا از غلام رسول مہر ص ۲۹۷) نظم خضر راہ میں یہ شعر اپنے سابقہ مصرعے کے ساتھ یوں درج ہے ۔

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر !

(بحوالہ کلیات اقبال ، حصہ بانگِ درا ، ص ۲۶۵ ۔

جس کی داد سر سید مرحوم نے یوں دی کہ ”میں اسے اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں ۔ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مجھ سے یہ پوچھے گا کہ تو ہماری بارگاہ میں کیا لے کر حاضر ہوا ہے ۔ تو میں کہوں گا کہ میں حالی سے مسدس لکھوا کے لایا ہوں“[۲] ۔

غرض اس دور میں قوم کی عظمت رفتہ اور قدیم تہذیب کا ماتم کیا گیا اس اثنا میں انگریزی حکومت و تسلط کی بنیادیں مضبوط ہونے لگیں اور یورپ کے لائے ہوئے معاشرتی اور سیاسی انقلاب کے بارے میں طنز کا زمانہ آیا ۔

یہ دور انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوا اور انیسویں صدی کے پہلے چند سال قائم رہا ۔ اس دور کی سب سے بڑی شخصیت اکبر الہ آبادی کی تھی ۔

یہ رنگ ، ماحول اور گرد و پیش سے غیر مطمئن ذہنی حالات کے پیدا ہونے کا نتیجہ تھا ۔ اکبر کا کلام مشرقی تہذیب و تمدن کی عظمت و برتری کا اعلان اور مغربی اثرات کے خلاف جنگ کا اعلان تھا ۔ جس کی صدا یوں آئی کہ

۲۔ بحوالہ مکتوب سر سید احمد خان بنام حالی مرقومہ ۱۰ جون ۱۸۷۹ء شملہ پارک ہوٹل ۔ اس خط کی عکسی نقل مسدس حالی صدی ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۳۵ء میں شامل ہے ۔ خط کی اصل عبارت یوں ہے ”بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں—“

مشرقی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لنڈن کی ہوا عہد وفا بھول گئے[۳]

تیسرا دور امید کا دور تھا ، جس کی ابتدا اقبال نے کی اور جس کی تکمیل کے خط و خال بھی اسی کے قوی ہاتھوں سے سنوارے گئے ۔

قومی شاعری کے اس تیسرے مرحلے پر قوم و وطن کا ایک تصور قائم ہوا ، لیکن اس تصور کے خط و خال مغربی اثرات کے کھنچے ہوئے تھے ۔ اس دور میں اقبال کے ساتھ اور بھی کئی گوشوں سے اس کی کی ہمنوائی کی آوازیں بلند ہوئیں ، لیکن اقبال کی آواز سے یہ سب آوازیں دب کر رہ گئیں اور اس بلند آہنگی کے باوجود اقبال خود اس منزل سے آگے نکل گیا ۔ یہ اس کی شاعری کا ابتدائی دور تھا ۔

اقبال کے یورپ کے سفر اور وہاں کے حالات کے مشاہدات سے اس کے وطنیت اور قومیت کے تصور میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کی نظر زندگی کے وسیع تر افق پر پڑنے لگی ، جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کی گود کی شفقت آمیز حرارت اور اپنے گھر کی چار دیواری کی محدود وسعت سے باہر جھانکنے لگے ۔ کبھی کبھی اقبال کے اس ابتدائی انداز کو ترک کرنے اور وسیع تر بین الاقوامی رنگ اختیار کرنے پر تعجب بلکہ افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے ، لیکن اقبال کی

۳۔ کلیات اکبر الہ آبادی (حصہ اول) شائع کردہ سنٹرل بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی (س ۔ ن) شعر کا پہلا مصرعہ کلیات مذکور میں صفحہ ۲۸۰ پر یوں درج ہے ۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے

عشرتی سے مراد سید عشرت حسین ہیں ، عشرتی کے ہم وزن اور قرین مفہوم ہونے کی بنا پر مشرقی مشہور ہو گیا مگر تحقیقی اعتبار سے یہ درست نہیں (مرتب)

اپنی شخصیت کا بنیادی رنگ کچھ اور تھا اور اس کی ذہنی وسعت اس تنگ دائرے میں دیر تک محصور نہیں رہ سکتی تھی ۔ اس کا اخلاق اور روحانی ترقی کی رہ پر پڑنا ناگزیر تھا ۔

اقبال کے انداز فکر میں اخلاق وسعت اور عظمت ہے اور اس وسعت اور عظمت کا اس کی شاعری پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا ۔

اقبال نے تاریخ عالم کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا اور اس پر مفکرانہ نظر ڈالی تھی ۔ اس کے سامنے نظام حیات کے وہ تمام تجربات تھے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں نے کیے تھے اور وہ ان قدیم تجربات کے علاوہ جدید تجربات کو بھی بڑے غور سے دیکھ چکا تھا اور ان کے مفید پہلوؤں اور مضرات سے آگاہ تھا ۔ اس کے نزدیک اسلام کا پیش کردہ نظام زندگی اور لائحۂ عمل بہترین دستور حیات تھا ، جس سے انسانیت ، مستفید ہو چکی تھی اور آئندہ مستفید ہو سکتی تھی ۔ اس کا قومی اور ملی زندگی کا تصور ، اسی نظام حیات سے ابھرا تھا ۔ اسلام نے اسی نظام حیات کے ذریعے بنی نوع انسان کو ایک نہایت صحت مند اور بلند روحانی انقلاب کا پیغام دیا تھا ۔ اقبال نے اسی پیغام کی تبلیغ و اشاعت کی ۔

اس پیغام میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تصویر ہے ۔ اسی میں فرد اور ملت کے باہمی ربط کی شیرازہ بندی ملتی ہے ۔ اسی سے فرد کے کردار اور شخصیت کے ڈانڈے جماعت اور ملت کے کردار اور شخصیت سے ملتے ہیں ۔ اسی سے خودی اور بے خودی کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے ۔

ملت افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اور افراد کی شخصیت ملت ہی کے آغوش میں رہ کر تشکیل ، تعمیر اور تکمیل کے مراحل طے کرتی ہے ۔اقبال کے اس پیغام کے اہم اجزا یہ ہیں :

۱- انسان کی عظمت اس کے دنیاوی رتبے، حیثیت ، وطن یا نسل و رنگ کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کی فطرت کی بلندی کی وجہ سے ہے -

۲- اس فطری بلندی کو قائم رکھنے کے لیے انسان کو اپنے ذاتی مفاد سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے مقاصد اور اغراض کو وسیع تر مقاصد اور اغراض پر قربان کرنا پڑتا ہے اور بلند اخلاقی اور روحانی اقدار کے پیش نظر بلند سے بلند تر نصب العین کی طرف حرکت کرنی پڑتی ہے -

۳- اسی نصب العین کے لیے انسان میں ذوق یقین اور خود اعتمادی آتی ہے اور زندگی میں حرکت اور خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے -

اقبال ایسا ذوق یقیں اور جوش عمل رکھنے والے انسان کو مرد مومن کا نام دیتا ہے اور ایسے ہی مردان مومن پر مشتمل معاشرے اور سوسائٹی سے اقبال کا تصور ملت ہمارے سامنے آتا ہے -

ملت کے اس تصور اور قوم کے تصور میں ایک ہلکا اور لطیف فرق ہے -

اقبال کے نزدیک قوم اور وطن کا مغربی تصور اور وہ سیاسی رنگ جو یورپ نے اسے دیا ہے، اسلام کے تصور ملت سے الگ ہے -

قوم اور وطن کے مغربی تصور نے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بجائے انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے اور انسانیت عالمگیر اخوت کی سالمیت میں سمو جانے کے عوض ، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی ہے -

وہ وطنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

لیکن اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اقبال مسلمانوں کے دلوں سے وطن کی محبت کو نکالنا چاہتا ہے۔

ایک بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں دنیا کی وسیع اور عالمگیر انسانی برادری سے دو چار ہوتی ہیں اور وہ دل میں ان کے لیے پیار اور محبت کے جذبات ابھرتے ہوئے محسوس کرتا ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ بچہ اپنی ماں کی گود کی شفقت آمیز حرارت اور اپنے گھر کی چار دیواری کی رفعت و عظمت کو فراموش کر چکا ہے۔

۴۔ کلیات اقبال، حصہ بانگ درا، ص ۱۶۰، ۱۶۱۔

اقبال اور تصوف*

اقبال ایک فلسفی تھے لیکن ان کے فلسفیانہ افکار کا سر چشمہ فی الحقیقت وہ ذہنی وراثت تھی جو انھوں نے غیر شعوری طور پر اپنے آبا و اجداد سے حاصل کی تھی ۔ وہ ایک نو مسلم خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ ایسا خاندان جو نہ صرف ہندو تھا بلکہ برہمن نسل سے تھا ۔ طبعی طور پر اس خاندان کا مذاق ویدانت میں رچا ہوا تھا ۔ مسلمان ہونے پر اس پر تصوف اسلامی کا رنگ آ گیا ۔ اقبال نے جس گھر میں پرورش پائی وہاں اسی تصوف کا چرچا تھا اور اسی کے زیر اثر ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی ہوئی ۔ انھوں نے تصوف کی معیاری کتابوں کا عمیق مطالعہ کیا اور شیخ شہاب الدین اور محی الدین ابن عربی کے خیالات و عقائد سے بہت متاثر ہوئے ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے قرآن و حدیث کو بھی بامعان نظر دیکھا تھا اور ان کی تعلیمات کی صحیح روح نے ان کے ابتدائی عقائد کو متزلزل کر دیا اور ان کے ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہوئی ۔ یہ کشمکش خالص اسلامی تعلیمات اور تصوف کے مروجہ عقائد کے درمیان تصادم کی وجہ سے پیدا ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تصوف کے عام مروجہ عقائد کو اس اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں جس نے مسلمانوں میں بے پناہ عملی قوتیں بھر دی تھیں اور انھیں زندگی کے ہر شعبے میں ممتاز اور سر بلند کیا تھا ۔

———

* مشمولہ منشورات اقبال (علامہ اقبال پر ریڈیو پاکستان سے نشر شدہ چند تقاریر) شائع کردہ بزم اقبال کلب روڈ لاہور (س ۔ ن) صفحات ۵۳ - ۵۸

حقیقت جوئی کی کئی ایک راہیں ہو سکتی ہیں - انھیں میں ایک تصوف کی راہ بھی ہے جو غالباً مذہب کے ظاہری رسوم و آداب کے خلاف ایک رد عمل کی صورت تھی - روحانیت کے پرستاروں نے کہا کہ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی مخصوص راہ متعین کرنا یا ظاہری ارکان و رسوم کی شدت سے پابندی کرنا اور انھیں مقصود بالذات یا لازمۂ دین قرار دینا ضروری نہیں -

ع ---- ہر جا کنیم سجدہ بداں آستان رسد

مذہب کا کام انسانی زندگی میں انسان اور اللہ کے درمیان ایک رشتہ قائم کرنا ہے - اور بس - اور باقی دوسری چیزیں سب عارضی ہیں - لیکن ان تصورات نے رفتہ رفتہ انسانوں میں قوت عمل کو کسلمندی کی نیند سلا دیا اور ویدانت اور تصوف دونوں سکون و جمود کا پیغام بن کر رہ گئے -

اقبال کو اس کا احساس تھا - اس کے سامنے اسلام کا وہ تصوف تھا جسے قرآن کی اصطلاح میں ''احسان'' کہتے ہیں - احسان کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی تمام کوششوں اور مساعی کو ایک بلند ترین مقصد ایک انتہائی حقیقت کے لیے وقف کر دے -

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لِلہ رب العالمین[1]

میری نماز ، میری قربانی ، میری زندگی ، میری موت اللہ ہی کے لیے ہے - اسلام نے اس حقیقت نہائی کو ایک ان دیکھے خدا سے تعبیر کیا اور اس کی طرف رجوع کرنے والوں کو یومنون بالغیب کا لقب دیا -

احسان در حقیقت ایمان ہی کی ایک بلند تر منزل کا نام ہے - یوں سمجھیئے کہ ایمان اگر پہلا قدم ہے تو احسان دوسرا - دونوں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں - اقبال ایمان کے ساتھ احسان کو تسلیم کرتا ہے اور آمنو کے بعد عملوا الصالحات کے حکم پر نظر ڈالتا

۱- القرآن پارہ ۸ ، سورہ الانعام -

ہے ۔ گویا احسان حسن عمل کا دوسرا نام ہے جس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور ایک مومن صحیح مومن نہیں ہو سکتا ۔ اسی عقیدۂ تصوف پر اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کی بنیاد رکھی اور اس انسان کو مومن کہہ کر پکارا جس کی خودی صحیح طور پر تکمیل پا چکی ہو ۔ دوسرے لفظوں میں وہ انسان مومن کہلانے کا مستحق ہے جو ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کا حامل بھی ہو ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ وہ اعمال صالح کیا ہیں ؟ وہ اعمال صالح صرف ارکان اسلام کی ظاہری صورت گری کا نام نہیں یہ اعمال صالح در اصل وہ تمام اعمال ہیں جو انسان سے کسی بلند نصب العین کے حصول کے لیے سرزد ہوتے ہیں ۔ ان اعمال میں بے پناہ قوت تسخیر ہوتی ہے اور ان کا دائرہ غیر محدود ہوتا ہے ۔ اسی قوت عمل نے مسلمانوں کو اپنی صحیح تعبیر کے ضمن میں ساری دنیا کا راہنما بنا دیا اور انھیں خیرالامم کا لقب دے کر دنیا میں ممتاز کر دیا تھا . ان مسلمانوں میں صرف شجاعت اور خشونت ہی نہیں تھی وہ محض قوت کے بل پر ہی دنیا پر مسلط نہیں ہوئے تھے بلکہ انھوں نے انسانی تہذیب کے لیے عظیم الشان خدمات بھی سر انجام دی تھیں ۔ ان کے افکار ذہنیہ نے علوم و فنون کو بھی معراج کمال پر پہنچا دیا تھا ۔ غرض وہ شاہراہ حیات میں طریق معرفت کے سہ گانہ پہلوؤں کے معتدل امتزاج کا صحیح مرقع تھے ۔

اقبال کے نزدیک عمل صرف مادی یا جسمانی حرکت کا نام نہیں ۔ اس کے نزدیک عمل اس وقت تک عمل نہیں بنتا جب تک کہ :

(۱) انسانی شعور نے پورے غور و خوض کے بعد اس کے سیاق و سباق کا اچھی طرح جائزہ نہ لے لیا ہو اور حالات کے پیش نظر اس کے حسن و قبح کو جانچ کر اسے احسن قرار نہ دیا ہو ۔

(۲) قلب انسانی کے لطیف اور بلند احساسات نے پرکھ کر ان پر صاد نہ کیا ہو ۔

(۳) وہ حرکت جو ان دونوں یعنی عقل و دل کی روشنی میں ظہور میں آئے تیسری چیز حرکت جب تک وجود میں نہیں آئی ، پہلی دونوں چیزیں بے کار ہیں بلکہ یہ احساس شکست خوردگی ہے جو زندگی کو تلخ اور بھیانک بنا جاتی ہے اور بدترین خصائص کو پیدا کرتی ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ حرکت کی رفتار شدت اور پھیلاؤ کسی عمل کا قطعی معیار نہیں۔ ورنہ ایک سانس میں پچیس میل دوڑنے والا پہلوان اس بے نیاز فقیر سے بہتر ہوتا جو کسی ظالم حاکم کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ یا ایک بلند آہنگ مقرر کی شبانہ روز تقریریں کسی غازی کی خلوص آمیز لبیک سے بڑھ جاتیں۔

اقبال ایک مرد مومن میں ان تمام چیزوں کا معتدل امتزاج دیکھتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا ، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں ، کار کشا ، کارساز
خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاکباز[۲]

اقبال کے نزدیک، اگر ان تینوں صفات میں سے کسی ایک میں کوتاہی واقع ہو تو خودی کی تکمیل صحیح نہیں ہو سکتی۔ تمدن ، شریعت ، سیاست ، تصوف سب ناتمام رہ جاتے ہیں اس کی مزید تشریح وہ یوں کرتا ہے۔

۲- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۸۹ -

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا ، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا[۳]

یہ عجم کے خیالات اور سالک کے مقامات وہی ہیں جو صحیح حرکت سے عاری ہیں اور اعمال صالح کے تحت میں نہیں آ سکتے ۔

ظاہر ہے کہ اقبال کا یہ انداز فکر اس تصوف سے بالکل مختلف ہے جو صدیوں سے دنیائے اسلام میں مروج رہا ہے ، جو بدقسمتی سے بڑی حد تک مسلمانوں میں جمود پیدا کرنے کا باعث بنا رہا ۔ جن لوگوں نے اس تصوف جہالی کو اپنا مسلک اور دین بنا لیا ان کے لیے مادی ماحول کے تکلیف دہ عناصر سے مصروف پیکار ہونا ناممکن ہے ۔ ان کو اس محویت میں وہ لطف حاصل ہوتا ہے کہ وہ وہیں کے ہو رہتے ہیں ۔ اقبال کا نظریہ تصوف انھیں جھنجھوڑتا ہے اور خواب سے بیدار کرتا ہے ۔

اقبال نے اپنے خیالات کو ایک اور مقام پر بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے ۔ وہ فقر کی تشریح یوں کرتے ہیں :

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت
ہے اس کا مقام شاہبازی !

۳- کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۴۱۶ ۔

روشن اس سے خرد کی آنکھیں
بے سرمۂ بو علی و رازی !

حاصل اس کا شکوہِ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی !

تیری دنیا کا یہ سرافیل
رکھتا نہیں ذوق نے نوازی

ہے اس کی نگاہِ عالم آشوب
در پردہ تمام کار سازی !

یہ فقرِ غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مرد غازی !

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری[۴]

تصوف میں فنا کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ اسی ذوق فنا نے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں ترک دنیا کا جذبہ پیدا کیا جو بڑھتے توکل، قنوطیت اور تقدیر پرستی تک پہنچ گیا اور اس سے قوم کے قوائے عمل بیکار ہو کر رہ گئے ۔ فرد کی خودی اور شخصیت دب کر رہ گئی اور زندگی کے ولولے اور بلند مقاصد اسے زہر قاتل نظر آنے لگے ۔ انھیں کے ساتھ زندگی کی ساری خوشیاں اور مسرتیں سو گئیں حدیث شریف میں آیا ہے : تخلقوا با اخلاق اللہ

"اپنے میں اللہ تعالیٰ کی صفات پیدا کرو"۔ اس حدیث کی روشنی میں انسانی زندگی کا مقصد یہ ٹھہرا کہ انسان اپنی شخصیت میں ان اوصاف جمیلہ کی تکمیل کرتا جائے اور تکمیل کا ہر قدم اسے خدا کے قریب تر کر دے ۔ یہاں پہنچ کر اہل تصوف کے دو گروہ ہوجاتے ہیں

۴۔ کلیات اقبال ، حصہ ضربِ کلیم ، ص ۵۵۱ ۔

عام گروہ کا عقیدہ یہی ہے کہ انسان مختلف مقامات سے گزر کر اپنے آپ کو ذات باری تعالٰی میں فنا کر دے لیکن ایک دوسرا گروہ اس کے بر عکس کہتا ہے کہ انسانی انجام یہ نہیں ہے کہ وہ ذات واجب کے سمندر میں غرق ہو جائے، بلکہ ذات الٰہی کو اپنے میں جذب کر لے تاکہ کبھی فنا نہ ہو ۔ یہ اس کا بلند ترین مقام ہے کہ وہ اس کا دو بدو مشاہدہ کرتے ہوئے بھی اپنی علیحدگی کو بدستور قائم رکھے ۔ یہی اقبال کا نظریہ ہے ۔ وہ کہتا ہے :

بہ بحرش گم شدن انجام مانیست اگر اورا تو گیری فنا نیست[۵]

''انسانی انا اس قطرے کی طرح ہے جو اپنے وجود کو کبھی سمندر میں گم ہونے نہیں دیتا ۔ تنگ مایہ ندی ریگستان میں جذب ہو جائے لیکن سمندر میں اپنے وجود کو فنا نہیں کرتی''۔

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی
در دلِ خاک فرو رفت و بدریا نرسید[۶]

ایسی شخصیت ، خودی یا انا کو جو یوں تکمیل پائے ، اقبال مومن کا لقب دیتا ہے ۔ صوفیائے اسلام اس امر میں اقبال سے متفق ہیں کہ ایسے شخص میں تاثیر ہوتی ہے اور وہ جسے چاہتا ہے فیضیاب کر دیتا ہے ۔ صوفیہ اس تاثیر کو نظر یا توجہ کا نام دیتے ہیں اقبال بھی نظر کا معتقد ہے ۔ نظر سے خبر پیدا ہوتی ہے جو شخص ایسے انا کے زیر اثر آتا ہے وہ پہلے سے بہتر بن جاتا ہے ۔ مرد مومن در حقیقت افراد اور اقوام کی سیرت اور تاریخ کا صانع ہوتا ہے ۔ انسان کے فکری ، اخلاقی اور روحانی ارتقا کی تاریخ دراصل ایسے ہی برگزیدہ لوگوں کے کارناموں کی تاریخ ہوتی ہے ۔

۵- کلیات اقبال ، حصہ زبور عجم ، ص ۵۵۱ ۔
۶- ایضاً ص ۳۸۲

ایسا بزرگ صحیح معنوں میں صاحب کرامات ہوتا ہے ۔ ایسی نمایاں اور عظیم شخصیت جب کسی قوم یا جماعت میں پیدا ہوتی ہے تو وہ قوم اور وہ جماعت اپنے اندر ایک نیا احساس زندگی پاتی ہے ۔

اقبال اس قوم کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے جس میں نہ اہل نظر ہوں نہ اہل دل نہ اہل عمل ۔

تربیتِ خودی*

تین مرحلے

اقبال کی دو مثنویاں ، اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی ، کا کلام اس کے پیام اور فردی و اجتماعی نظامِ حیات کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ۔ مجموعی طور پر اس کے افکار سے آشنا ہونے کے لیے اس کے چند اہم حقائق سے واقف ہونا لازمی ہے ۔

اقبال نے احساس خودی کے آغاز اور انجام تک کے دو تین مرحلے مقرر کیے ہیں اور وہ تین مرحلے یہ ہیں ۔ اطاعت ، ضبط نفس ، نیابتِ الٰہی ۔

حسن فکر ہی سے اسلوبِ بیان کا حسن نکھرتا ہے ۔ اقبال مفکر بھی ہے اور فنکار بھی ۔ وہ نادر تشبیہوں اچھوتے استعاروں اور بر محل تمثیلوں سے دقیق مسائل کو اس طرح واضح کرتا ہے کہ وہ زندہ متحرک حقائق کی صورت میں ہمارے سامنے آ جاتے ہیں ۔

اطاعت ، ضبط نفس ۔ نیابت الٰہیہ ، تین کٹھن مرحلے ہیں مگر اقبال کا اعجاز تخیل اور اس کی جادو بیانی دیکھیے ۔ اطاعت کی ایسی فلسفیانہ تشریح کی کہ جبر و اختیار کا مسئلہ حل ہو گیا ۔

---

* مطبوعہ قسط وار ہفت روزہ پاک جمہوریت لاہور ، ۱۱ اگست تا ۲۸ ستمبر ۱۹۷۷ء صفحات بالترتیب ۱۳ ، ۸ ، ۱۴ ۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
سی شود از جبر پیدا اختیار[1]

جبر عالم مجبوری ہے اور اختیار آزادی اور حریت کا نام ہے اقبال کے نزدیک اعلیٰ اور ارفع حریت ، اطاعت یعنی پابندیٔ ضوابط ہی سے پیدا ہوتی ہے - فرائض سے مقصود ، آئین و ضابطہ اور آئین و ضوابط کی پابندی اطاعت ہے -

یہ اطاعت یہ فرمان پذیری انسان کو صحیح احساس عظمت دلاتی ہے بقول اقبال کے انسان بظاہر اسیر تو نظر آتا ہے لیکن مردِ حُر ہوتا ہے - ہوا کو دیکھو فضا میں آزادانہ گھومتی ہے لیکن جہاں پھول کے آغوش میں سمائی خوشبو بن گئی - اس قید و بند نے اسے نافۂ آہو بنا دیا -

ان ستاروں اور سیاروں پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کس طرح منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہیں - آئین حیات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہوا ہے - اب ذرا سنیے :

اونٹ محنت کش جانور ہے - سبھی جانتے ہیں کہ تپتی ہوئی ریت میں کس طرح انتہائی صبر و استقلال سے خراماں خراماں چلا جاتا ہے ، گویا ریگستان کی کشتی رواں ہے - اقبال کے اشعار سنیے اور سر دھنیے :

خدمت و محنت شعارِ اشتراشت
صبر و استقلال کارِ اشتراست

نقشِ پایش قسمتِ ہر بیشۂ
کم خور و کم خواب و محنت پیشۂ

۱- کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۴ -

مست زیرِ بارِ محمل می رود
پائے کوباں سوئے منزل می رود

سر خود از کیفیتِ رفتارِ خویش
در سفر، صابر تر از اَسوارِ خویش[۲]

اس تصویر کے خدو خال دیکھیے - کیسے حسین اور دل نشین ہیں اور ان خدو خال کی تہہ میں کتنی کیفیت اور کیسا جذبہ کار فرما ہے -

اپنے سوار کے اشاروں پر چل رہا ہے اور ناز کر رہا ہے اور اس سر خوشی کے عالم میں کر رہا ہے کہ سوار کو اس پر ناز رہے -

اقبال یہ تمثیل بیان کرنے کے بعد کہتا ہے :

تو ہم از بارِ فرائض سرمتاب
بر خوری از عُقدہ حُسن المآب[۳]

اے انسان تو بھی اپنے فرائض سے روگردانی نہ کر - تیری اطاعت اور پابندیٔ فرائض تجھے اعلیٰ مقام پر پہنچائے گی -

محنت ہی سے سعادت کی دولت نصیب ہوتی ہے - ہر شے کے اندر آئین پوشیدہ ہے اور اس ضبط آئین نے اسے قومی اور مستحکم بنا رکھا ہے - آئینِ وصل ہی سے قطرے دریا اور ذرے صحرا بنتے ہیں -

تو نے اپنے دستور قدیم ، یعنی آئین کو کیوں ترک کر دیا ہے - اس دستور قدیم کی پابندی کر -

دستورِ قدیم کی پابندی اسیری نہیں ، آزادی ہے

۲- کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۴۰ -
۳- ایضاً ، ص ۴۱ -

بظاہر یہ زنجیر اسیری نظر آتی ہے - لیکن یہ زنجیر گراں مایہ ہے اسے اپنے پاؤں کی زینت بنا لے -

یہ تجھے حسن عطا کرے - حسن کردار ، حسن شخصیت یہ تجھے سعادت کرے گی - سعادتِ دینی و اخلاقی و روحانی عطا کرے گی -

شکوہ سنج سختی آئیں مشو از حدودِ مصطفٰی بیروں مرو[۴]

---

(۲) ضبطِ نفس

اقبال تربیت خودی کے سلسلے میں اطاعت کے بعد دوسرے مرحلے کا تذکرہ کرتا ہے اور وہ ضبطِ نفس ہے - اطاعت کے ضمن میں اس نے شتر (اونٹ) کی علامت استعمال کی : اور یہ کہا کہ یہ جانور بڑا جفا کش اور محنت شعار ہے اور صبر و استقلال کا مجسمہ ہے - ضبطِ نفس کا ذکر کرتے ہوئے پھر اسی کی مثال دیتا ہے اور اس مثال میں علامت کا مفہوم بدل دیتا ہے - شتر کی زندگی کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کر کے یہ کہتا ہے کہ یہ جانور خود پرست اور خود سر بھی ہے - اس سے کام لینے کے لیے اسے قابو میں رکھنا پڑتا ہے -

ایسا ہی حال انسان کے نفس کا ہے - اونٹ کی طرح نفس کی باگ ڈور زور سے تھام کر رکھنی پڑتی ہے - جہاں ذرا یہ باگ ڈھیلی پڑی ، نفس کی سر کشی بڑھ گئی - اگر انسان اپنے پہ حکمران نہ ہو گا تو اسے دوسروں کا تابع فرمان ہونا پڑے گا -

---

۴- کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۴ -

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں[۵]

اقبال اس خوبصورت شعر کی تفصیل یوں بیان کرتا ہے ۔ کہ انسان کی تعمیر مٹی اور پانی سے ہے ۔ اس خاک کے پتلے میں ، جہاں محبت کا خمیر ہے وہاں اس کی طینت میں خوف کا عنصر بھی شامل ہے ۔ اپنی جان کا خوف ، دنیا کا خوف ، عقبٰی کا خوف غرضیکہ زمین و آسمان کے تمام آلام کا خوف ۔ جس سے محبت کا وسیع جذبہ سمٹ کر چھوٹی چھوٹی محبتوں کے خول میں دب کر رہ جاتا ہے ۔ حُبِ زورو زروزن چھا جاتی ہے ۔ ایک طرف مال و دولت کا لپکا اور دوسری طرف ، خویش پروری اور اقربا نوازی کا چسکا ابھر آتا ہے ۔

ان مخمصوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسلام کے بنیادی ارکان کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے توحید ، نماز ، روزہ ، زکواۃ اور حج ۔

توحید کا راز ، لا الہ الا اللہ کے دو لفظوں میں پوشیدہ ہے ، اپنے آپ کو خالقِ حقیقی کے زیر اطاعت کر لینا ، اور اس کے روبرو سرتاپا تسلیم و رضا بن جانا جس کی مکمل تصویر ہمیں حضرت ابراہیم[۴] میں ملتی ہے ، جس نے دنیا کی ہر خواہش کو تج کر ، خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی کے آگے سر خم کر دیا ۔

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد ! فارغ از بندِ زن و اولاد شد[۶]

کلمۂ لا الہ گویا صدف ہے ، جس کا گوہر تابدار نماز ہے ۔ جسے حجِ اصغر کا مقام حاصل ہے اور جو ''تنہٰی عن الفحشاء والمنکر'' کا سرچشمہ ہے ۔

۵- کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۴۲ ۔
۶- ایضاً ، ص ۴۲ ۔

روزہ انسانی زندگی میں ضبط و نظم پیدا کرتا اور
خیبرِ تن پروری را بشکند

بڑے سے بڑے حصارِ نفس کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

زکٰوۃ ، انسانی مساوات کو قائم رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ زکٰوۃ انسانی طبائع کو اعتدال پر لاتی ہے۔ حُبِ دولت کو مٹاتی ہے اور ایثار کے جذبے کو ابھارتی ہے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے اور نظامِ حیات میں اعتدال پیدا کرتی ہے۔ قرآن کے فرمان کے مطابق زکواۃ نیکی کے معراج کی نشان دہی ہے۔

"اس سے زر میں اضافہ ہوتا ہے اور محبتِ زر میں کمی آ جاتی ہے۔ انسان شوق سے کماتا ہے ، اور شوق سے خرچ کرتا ہے۔"

اقبال کے الفاظ دیکھیے :

حُبِ دولت را فنا سازد و زکواۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکواۃ
دل "ز حتی تنفقو" محکم کند
زر فزاید ، الفتِ زر کم کند[۸]

پھر فریضۂ حج ہے کہ صرف سفر اور طواف ہی نہیں ، مسلمانانِ عالم کی یک جہتی کی علامت بھی ہے۔

وہ ہمیں چھوٹے چھوٹے ٹھکانوں کی محدود سکونتوں سے باہر نکال کر ایک وسیع اور کشادہ فضا میں لے جاتا ہے ایک عالم گیر ،

۷۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۴۳ ، مکمل شعر یوں ہے :
روزہ برجوع و عطش شبخوں زند خیبر تن پروری را بشکند
۸۔ ایضاً ، ص ۴۳۔

آفاقی فضا کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

اس کے اسلامی جمعیت کی شیرازہ بندی ہوتی اور ملت کے قلبی اور روحانی ربط و نظم کا احساس تازہ ہوتا ہے حج ایک بڑی سعادت ہے ۔ اس حصولِ سعادت پر جس قدر ناز کیا جائے کم ہے ۔ اس سعادت کو جسمانی اور مادی منفعتوں میں محصور نہیں کیا جا سکتا ۔ اقبال کہتا ہے ۔

زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں[۹]

سب سے بڑا تحفہ تو خود یہ سعادتِ عظمیٰ ہے ۔ جو باقی سعادت مندیوں سے پیوست ہو کر ملت کے استحکام کے باعث بنتی ہے ۔

بقول اقبال یہ تمام ارکان انسانی زندگی کی عظمت و استحکام کا ساز و سامان ہیں ۔ یہ اسلام ہے اور اگر اسلام محکم ہے تو اسلام کے پرستار بھی پختہ اور محکم ہیں ۔

ایں ہمہ اسباب استحکام تست پختہ محکم اگر اسلام تست[۱۰]

لیکن لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اس کی بنیاد ضبطِ نفس پر ہے اور ضبطِ نفس ایک عظیم مجاہدہ ہے ۔ بقول حافظ :

ناز پرور تنعم نبرد راہ بدوست عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد[۱۱]

۹۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ بانگ بانگ درا ، ص ۱۳۵ ۔
۱۰۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۴۳ ۔
۱۱۔ دیوان حافظ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ، ص ۱۶۹ ۔

اقبال کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ وہ دنیا میں نائب حق کا کردار ادا کرے اور اس منصب کے طفیل اس مادی دنیا میں حکمرانی کرے ۔ اس بیان کا تعلق قرآن پاک کی آیت ''انی جاعل فی الارض خلیفہ''[۱۲] سے ہے ۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اسرار خودی پر بحث کرتے ہوئے نیابتِ الٰہی کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں ۔

> ''اقبال کے یہاں خودی کا تصور در حقیقت قرآن کریم کے نیابت الٰہی کے تصور کا آئینہ ہے خدا کی ذات لامتناہی قوتوں کا سر چشمہ ہے ۔ خدا کی مشیت اور قوتوں کے سامنے ، خاک و افلاک ، ذرہ خورشید ، سب سر بسجود ہیں ۔ قرآن کریم میں جس نصب العین آدم کا تصور پیش کیا گیا ہے ۔ وہ بھی ایسا آدم ہے جس کے آگے فرشتے سر جھکاتے ہیں ، بظاہر اس میں تضاد نظر آتا ہے لیکن اس تضاد سے توحید میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ جب کسی بادشاہ کا وزیر یا نائب ، پوری طرح سے اس کی سیاست کو سمجھنے والا اور تہہ دل سے اس کے احکام کو بجا لانے والا ہو تو اقتدار کا سر چشمہ بادشاہ ہوتا ہے لیکن رعایا کو وزیر نائب کی اطاعت اسی طرح کرنی پڑتی ہے جس طرح بادشاہ کی[۱۳]''

انسان کا نصب العین یہ ہے کہ کائنات کی وہ قوتیں جنھیں ملائکہ کہتے ہیں سب کے سب اس کے لیے مسخر ہوں ۔ اس کے لیے انسان کو لازم ہے کہ وہ مشیتِ ایزدی کے عرفان سے اپنی خودی کو

۱۲- القرآن پارہ اول ، سورہ بقرہ ۔
۱۳- فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ، شائع کردہ بزم اقبال کلب روڈ لاہور ۱۹۶۸ء ، ص ۴۴۴ ۔

استوار کرتا چلا جائے ۔ اس تسخیر کی قوت کی کوئی حد نہیں نباتات حیوانات اور اجرامِ فلکیہ پر قدرت و اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ ملائکہ اور انبیاء اور آخر میں خدا کے ساتھ ہمکنار ہو سکے گا ۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں اقبال کہتا ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[۱۴]

ایسا انسان ہی صحیح معنوں میں نائب حق یا خلیفہ اللہ ہوگا ۔ ایسا اقبال کے نزدیک اسی عالم ہی کی تسخیر نہیں کر سکے گا ، بلکہ وہ نئے عالم کی تخلیق بھی کرے گا ۔

فطرتش معمور ومی خواهد نمود عالمے دیگر بیارد در وجود

زندگی راسی کند تفسیر نو ، میدهد ایں خواب را تعبیر نو[۱۵]

اقبال نے جذبے اور جوش میں آ کر ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں انسانیت اور الوہیت کے ڈانڈلے ملتے نظر آتے ہیں ۔ قرآن پاک میں بعض آیات میں ایسے اشارے ملتے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اگر عبودیت میں کامل ہو جائے تو وہ خدا کی ذات کو اپنی ذات میں سمو لیتا ہے ۔

اسلامی تعلیم کے مطابق انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرے اور انھیں اس حد تک بڑھاتا چلا جائے کہ خدا کے قریب تر ہو جائے ۔ مولانا روم ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :

"لوہا آگ میں پڑ کر آگ کا ہم شکل اور بڑی حد تک
اس کا ہم صفت ہو جاتا ہے بہت سے کام جو آگ کر
سکتی ہے وہ ایسی حالت میں لوہا بھی کر سکتا ہے ۔

۱۴۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۵۵ ۔
۱۵۔ کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۴۴ ، ۴۵ ۔

لوہا اگر ایسی حالت میں ، جب وہ آگ کی طرح گرم
اور سرخ ہو ، اپنے آپ کو ''من آتشم'' (میں آگ ہوں)
کہے تو وہ حق بجانب ہوگا ۔ اگرچہ اس کے باوجود آگ
اور گرم لوہے میں امتیاز باقی رہے گا ۔

اسی طرح جو بندۂ اخلاق الٰہیہ کے حصول سعی بلیغ کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے ، اس میں اور خدا میں ذاتی امتیاز بدستور قائم رہے گا ۔ یعنی خالق و مخلوق کا امتیاز ۔

یہ کہنے کے بعد اقبال ، رسول پاکؐ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں یہ اشعار لکھتا ہے :

ذات او توجیہہ ذات عالم است از جلال او نجاتِ عالم است

نوعِ انسان را بشیر وہم نذیر ہم سپاہی ، ہم سپہ گر ، ہم امیر

چوں عناں گیرد بدست آں شہسوار تیز تر گردد سمندِ روزگار[16]

وہ بشیر بھی اور نذیر بھی ۔ وہ سپاہی بھی ۔ سالار لشکر بھی اور صاحب امر بھی جب وہ شہسوار میدان میں نکلتا ہے تو زمانے کے اسبِ تیز رو کی رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے اس کی ذات شان اور ''لولاک'' ہے اسی کے مبارک دم سے نجاتِ عالم ہے ۔

پھر اقبال اخیر میں ، مولانا جامی کی طرح، رسولِ اکرمؐ سے خطاب کر کے کہتا ہے ۔

اے سوار اشہبِ دوراں بیا اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

شورش اقوام را خاموش کن نغمۂ خود را بہشت گوش کن

باز در عالم بیار ایام صلح جنگجویاں رابدہ پیغام صلح

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر از جبینِ شرمسارِ ما بگیر[17]

۱۶- کلیاتِ اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۴۵ ۔
۱۷- ایضاً ، ص ۴۶ ۔

سنائی و اقبال*

کوئی نصف صدی پہلے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے نمائندہ کے طور پر پنجاب یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ میرا موضوع تاریخ ادبیات فارسی تھا۔ درس کے دوران میں اس مشہور قول کا حوالہ دیتا تھا کہ :

''باید دانست کہ در شعر عارفانہ و قلندرانہ نیز سہ کس پیغمبران سخن ھستند سنائی و عطار و رومی''

اس سے مراد یہ تھی کہ شاگردوں کو مثنوی میں فردوسی ، قصیدے میں انوری اور غزل میں سعدی کے بے نظیر مقام سے روشناس کرایا جائے اس بات کا اضافہ کیا کرتا تھا کہ عارفانہ اور قلندرانہ فارسی شاعری کے بھی تین مشہور پیغمبران سخن ہیں۔ سنائی ، عطار اور رومی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ ان پیغمبران سخن کا نام لیتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور میرے دل میں

---

* فاضل مصنف نے یہ مقالہ فارسی زبان میں تحریر کیا اور حکیم سنائی کی نو سو سالہ تقریبات ولادت کے موقع پر اکتوبر ۱۹۷۷ء میں افغانستان میں پڑھا - ۱۹۷۸ء میں 'یاد اقبال' بکوشش بہاء الدین اورنگ شائع کردہ خانۂ فرہنگ ایران لاہور میں صفحات (۷۱ - ۷۸) شائع ہوا - مقالہ مذکور کا اردو ترجمہ نذر قارئین ہے - اردو ترجمے کے لیے راقم ڈاکٹر محمد ریاض کی معاونت کا شکر گزار ہے - (مرتب)

وجد اور حال کی کیفیت ظاہر ہو جاتی تھی مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آنسوؤں کا ایک طوفان میرے سینے سے اٹھا اور میرے حلق تک آ پہنچا۔ میں اس وقت بقول اقبال، ایسے سوچتا تھا۔

سرمایۂ درد تو، غارت نتواں کردن
اشکے کہ ز دل خیزد، در دیدہ شکستم من[1]

یعنی یہ آنسو میرا سرمایہ درد ہے اور اس بیش بہا سرمائے کو غارت نہیں کرنا چاہیے اس لیے میں ضبط کرتا تھا اور آنسوؤں کے اس سرمائے کو آنکھوں میں ہی روک لیتا تھا۔

میرے تلامذہ میری کیفیت دیکھ کر حیران ہو جاتے تھے، مگر خاموش رہتے تھے مگر میں اس وقت اپنی آنکھوں کے سامنے حکیم سنائی رحمتہ اللہ علیہ کی تصویر عالم خیال میں دیکھ رہا ہوتا تھا اور ان کے مندرجہ ذیل دو مجزوبانہ شعر گویا نہایت بلند اور موثر آواز میں میرے کانوں کو سنائی دینے لگتے تھے۔

مسلمانان، مسلمانان، مسلمانی؟ مسلمانی؟
ازیں آئیں بیدیناں پشیمانی پشیمانی؟

مسلمانی کنوں اسمیست بر عرفی و عاداتی
دریغا کو مسلمانی؟ دریغا کو مسلمانی؟[2]

ہمیں معلوم ہے کہ حکیم سنائی نے یہ اشعار جذب و کیف کی حالت میں کہے تھے اور ان کے جذب و کیف کی کئی داستانیں مشہور ہیں لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ حکیم سنائی میں جو اندرونی انقلاب رونما ہوا آیا وہ کسی لائے خوار (شراب کی

۱۔ کلیات اقبال، حصہ پیام مشرق، ص ۳۲۲۔
۲۔ دیوان حکیم السنائی الغزنوی مطبوعہ بسرمایہ شرکت طبع کتاب ۱۳۲۰ شمسی ص ۵۰۷-۵۰۸۔

تلچھٹ پینے والا) کی مستانہ گفتگو کا نتیجہ تھا یا کسی قصاب کے بیٹے کے عشق میں اُن کی پختگی کا شاخسانہ کہ وہ مجاز سے حقیقت کی طرف پہنچے تھے ۔ لیکن حکیم سنائی کی زندگی کی اس طرح کی داستانوں سے مجھے علامہ اقبال کی جوانی کے بعض واقعات کی یاد آتی ہے، مثلاً انھوں نے رموز بے خودی میں خلق محمدیہؐ کے ذریعے حسن سیرت حاصل کرنے کے بیان میں اپنی ایک داستان لکھی ہے ۔

سائلے مثل قضائے مبرمے
بر در ما زد صدائے پیہمے
از غضب چوبے شکستم برسرش
حاصل در یوزہ افتاد از برش
عقل در آغاز ایام شباب
می نیندیشد صواب و نا صواب
از مزاج من پدر آزردہ گشت
لالہ زار چہرہ اش افسردہ گشت
برلبش ہے جگر تابے رسید
درمیان سینہ او دل تپید
کوکبے در چشم او گردید و ریخت
بر سر مژگان دمے تابید و ریخت
ہمچوں آں مرغے کہ در فصل خزاں
لرزد از باد سحر در آشیاں
در تنم لرزید جان غافلم
رفت لیلائے شکیب از محملم
گفت فردا امت خیر الرسلؐ
جمع گردد پیش آں مولائے کل

غازیان ملت بیضاے او
حافظان حکمت رعناے او

ہم شہیدانے کہ دیں راحجت اند
مثل انجم در فضاے ملت اند

زاہدان و عاشقان دل فگار
عالمان و عاصیان شرمسار

درمیان انجمن گردد بلند
نالہ ہاے ایں گداے دردمند

اے صراطت مشکل از بے مرکبی
من چہ گویم چون مرا پرسد نبیؐ

حق جوانے، مسلمے باتو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد

از تو ایں یک کار آسان ہم نشد
یعنی آنِ انبارِ گلِ آدم نشد

در ملامت نرم گفتار آں کریم
من رہینِ خجلت و امید و بیم

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر
اجتماعِ امتِ خیر البشرؐ

باز ایں ریشِ سفید من نگر
لرزہ بیم و امیدِ من نگر

بر پدر ایں جور نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

غنچہ از شاخسار مصطفٰیؐ
گل شو از باد بہار مصطفٰیؐ[۳]

اس واقعہ کے بعد اقبال کا غنچہ دل باغ مصطفٰی میں وا ہوا اور ان کے دل سے زندگی افروز نغمے نکلے۔ انھوں نے زور دار شعر کہے اور دوسروں کو بیدار کیا ۔ وہ ایک ستارے کی طرح آسمان پر چمکے اور زندگی کے راستے تابناک کیے تا کہ دوسرے ان کے نقوش راہ دیکھ کر اطمینان سے چلیں ان کا نغمہ کانوں کے لیے بانگ درا بنا۔ حکیم سنائی اور ترجمان حقیقت علامہ اقبال کی زندگی میں مماثلت کا ایک پہلو یہی ہے -

حکیم سنائی کے دل سے بلند ہونے والے وہ تابناک اور پر سوز شعلے جنھوں نے عطار کے سینے کو روشن کیا تھا اور بعد میں حضرت رومی کے قلب و نظر کو تابناک بنایا تھا آخر کار حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے قلب و نظر کی متاع بنے ۔ ان تابناک شعلوں نے شمع اور پروانے، دونوں کو خاکستر کر کے رکھ دیا ، گویا شیخ علی حزیں کے بقول :

بلوح مشہد پروانہ این رقم دیدم
کہ آتش کہ مرا سوخت ، خویش را ہم سوخت[۴]

اب میری خواہش ہے کہ مثنوی مسافر کی روشنی میں ہم حضرت علامہ اقبال کے ہمراہ کابل سے غزنی چلیں اور وہاں حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کریں۔ غزنی اور حکیم سنائی کا نقشہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے -

آہ غزنی آں حریم علم و فن
مرغزار شیر مردان کہن

۳- کلیات اقبال ، حصہ اسرار و رموز ، ص ۱۳۰ ، ۱۳۱ -

۴- کلیات شیخ علی حزیں مطبوعہ نول کشور اور دیوان علی حزیں مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور میں یہ شعر موجود نہیں ہے -

دولت محمود را زیبا عروس
از حنا بندانِ او دانای طوس
خفته در خاکش حکیم غزنوی
از نوای او دلِ مردان قوی
آن حکیمِ غیب ، آن صاحب مقام
ترک جوش رومی از ذکرش تمام
من ز پیدا ، او ز پنهان در سرور
هر دو را سرمایه از ذوقِ حضور
او نقاب از چهره ایمان کشود
فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود
هر دو را از حکمتِ قرآن سبق
او ز حق گوید من از مردانِ حق
در فضائے مرقدِ او سوختم
تا متاعِ نالهٔ اند و ختم
گفتم اے بینندهٔ اسرارِ جان
بر تو روشن ایں جهان وآں جهان
آں چه اندر پردهٔ غیب است گوے
بو که آبِ رفته باز آید بجوے[۵]

وہاں شاعر مشرق کو حکیم سنائی کی روح ان کے استفسارات کا جواب بہشت بریں سے دیتی نظر آتی ہے -

راز دانِ خیر و شر گشتم ز فقر
زنده و صاحب نظر گشتم ز فقر

۵- کلیات اقبال ، حصہ پس چہ باید کرد مع مسافر ، ص ۸۶۲ ، ۸۶۳ -

یعنی آں فقری کہ داند راہ را
بیند از نور خودی اللہ را

اندرون خویش جوید لا الہ
در تہ شمشیر گوید لا الہ

مومنان زیر سپہرِ لا جورد
زندہ از عشق اندونہ از خواب و خورد

می ندانی عشق و مستی از کجاست ؟
ایں شعاعِ آفتاب مصطفٰی است

زندہ ای تا سوزِ او در جان تست
ایں نگہ دا رندہ ایمانِ تست

دین مجو اندر کتب ای بی خبر
علم و حکمت از کتب دین از نظر

بو علی د اندہ آب و گل است
بی خبر از خستگیہای دل است

نیش و نوشِ بو علی سینا بہل
چارہ سازیہای دل از اہلِ دل[۶]

اقبال کے یہ تمام احساسات اور افکار اس بات کی علامت ہیں کہ اس پاکستانی مفکر کو حکیم سنائی سے بے پناہ عقیدت تھی اور ان کے معنوی مرشد مولانا روم کی محبت نے اس عقیدت اور ارادت میں اضافہ کیا تھا۔ اقبال نئی فکر کے علمبردار تھے اور انھوں نے حیات انسانی کے حقائق اور مسائل کو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے نئے طریقوں سے پیش کیا اور نوع انسانی کو ایک پیغام یا لائحہ عمل دیا جسے ہم ایک اعلٰی اور پسندیدہ نظام حیات کہہ

۶- کلیات اقبال ، حصہ پس چہ باید کرد مع مسافر ، ص ۸۶۴ ، ۸۶۵ -

سکتے ہیں اقبال کا یہ پیغام فرد اور ملت دونوں پر محیط ہے اور اس سلسلے میں وہ حکیم سنائی سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے مثنوی مسافر میں کہتے ہیں -

ہر دو را از حکمت قرآن سبق
او ز حق گوید من از مردان حق[۷]

مردان حق کا ذکر کیا ہے ؟ درس عمل ہے اور ہم با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا اہم ترین کام یہی تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کے اکابر کا ذکر کر کے ان کے پیغام اور درس زندگی کو عام کیا بلکہ ان کے افکار کو نئی جہتیں دیں اور اپنے پیغام کے ذریعے معاصر نوجوانوں کو اس طرح مخاطب کیا کہ ان کی رگوں میں خون حیات دوڑنے لگا -

اقبال کو سنائی سے کافی عقیدت تھی اس کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے شعر میں سنائی کی تقلید کی ہے اقبال دراصل ایک نئے اسلوب کے نقیب تھے اور ان کا یہ اسلوب پاکستان کے ادب جدید میں نمودار ہو رہا ہے اس لیے انھیں کسی دوسرے کا مقلد نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن سنائی اور اقبال کے اشعار اور افکار کا جب ہم موازنہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ چونکہ دونوں شاعروں کا منبع اور مصدر قرآن مجید تھا لہذا کہیں کہیں انھوں نے کتاب الہی کی اس ابدی صدف سے موتی رولے ہیں - اور ان کے کلام میں بعض جگہ ایک جیسی عارفانہ جذب و مستی نظر آتی ہے جو پڑھنے والے کے رگ و پے میں سرایت کرتی ہے مثلاً بال جبریل میں اقبال کی ایک غزل نما نظم ہے جسے انھوں نے ''افکار پریشان'' کا عنوان دیا ہے - یہ نظم یا غزل اقبال کے ادبی شاہکاروں میں سے ہے - اور اس میں انھوں نے بحر ، قافیے اور ردیف میں

۷- کلیات اقبال ، حصہ پس چہ باید کرد مع مسافر ، ص ۸۶۲ -

حکیم سنائی کے ایک قلندرانہ ، اور عارفانہ قیصدے کی پیروی کی ہے ، اس قصیدے کے چند اشعار میں یہاں نقل کرتا ہوں ۔

مکن در جسم و جان منزل کہ این دون است و آن والا
قدم زین ہر دو بیروں نہ ، نہ اینجا باش و نہ آنجا
عجب نبود گر از قرآن نصیبت نیست جز نقشی
کہ از خورشید جز گرمی نیا بد چشم نابینا
چو علمت ہست خدمت کن چو دانایان کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا
نہ صوت از بہر آن باشد کہ سوزی مزہر زہرہ
نہ حرف از بہر آن آمد کہ دزدی چادر زہرا[۸]
چو لا از حدِ انسانی فگندت در رہ حیرت
پس از نور الوہیت بہ اللہ آئی از الا

اقبال کی غزل کا مطلع یوں شروع ہوتا ہے ۔

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شائد ترا اندازۂ صحرا ![۹]

اقبال نے جنوں کے آگے وسعت صحرا کی تنگی کا جو ذکر کیا ہے اسے کوئی سو سال پہلے مرزا غالب نے بھی اپنے کلام میں بیان کیا ہے ۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ نیم بیضۂ مور آسمان ہے

۸- دیوان حکیم السنائی الغزنوی ، ص ۴۸ ۔
۹- کلیات اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۱۴ ۔
۱۰- دیوان غالب (اردو)، مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو (ہند) علی گڑھ ۲۰۳-

حکیم سنائی نے اپنے قیصدے کے مطلع میں جو بات کہی تھی ۔

مکن در جسم و جاں منزل کہ این دون است و آن والا
قدم زین ہر دو بیروں نہ ، اینجا باش و نہ آنجا[11]

اسے اقبال نے ایک دوسری غزل میں یوں بیان کیا ہے ۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی[12]

سنائی کہتا ہے ۔

چو علمت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا[13]

اقبال نے اس ایک مصرع کو یوں تضمین کیا ہے ۔

حضور حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا !

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
"گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا"[14]

سنائی نے اس قیصدے میں کہا تھا ۔

نہ صوت از بہر آن آمد کہ سوزی مزہر زہرہ
نہ حرف از بہر آن آمد کہ دزدی چادر زہرا[15]

۱۱- دیوان حکیم سنائی ، ص ۴۸ ۔
۱۲- کلیات اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۳۰۶ ۔
۱۳- دیوان حکیم سنائی ، ص ۴۸ ۔
۱۴- کلیات اقبال ، حصہ بال جبریل، ص ۳۱۶ ۔ دوسرا مصرعہ حکیم سنائی کا ہے ۔
۱۵- دیوان حکیم سنائی ، ص ۵۱ ۔

اقبال کہتا ہے۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ[۱۶]

سنائی نے فرمایا۔

سخن کز روی دین گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکان کز بہر حق جوئی چہ جا بلقا جا بلسا[۱۷]

اقبال ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں۔

ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں، حرفِ محبت ترکی نہ تازی[۱۸]

ان سطور سے سنائی اور اقبال کے اشعار کی کچھ مماثلت ظاہر ہو جاتی ہے حکیم سنائی ایک روشن ضمیر اور بالغ نظر انسان تھے وہ اپنے زمانے کے دانائے حقائق تھے اقبال کا دانائے راز ہونا کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے اقبال نے اپنے عصر کے تقاضوں کے مطابق اسلوب میں اصطلاحوں اور کلمات کی رنگا رنگی دکھائی اور اپنے جدید افکار پیش کیے لیکن سنائی اور کئی دوسرے بزرگوں کے ساتھ ان کی فکری ہم آہنگی میں کلام نہیں۔

ولادت اور وفات کی تاریخوں کا تعین بھی اہم بات ہے کیونکہ اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ کس زمانے کے بزرگ نے کیا بات کہی اور دوسرے نے اس کو کس طرح آگے بڑھایا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عارفانہ کلام، اخلاقی اقدار اور روحانی مسائل ایسی چیزیں ہیں جو جاوداں اور ابدی ہیں یہ ماضی میں تھے آج بھی ہیں

۱۶- کلیات اقبال، حصہ بال جبریل، ص ۳۱۵۔
۱۷- دیوان حکیم سنائی، ص ۵۲۔
۱۸- کلیات اقبال، حصہ بال جبریل، ص ۲۶۳۔

اور آئندہ بھی موجود رہیں گے اس لیے زمان و مکاں سے ماورا جاننا چاہیے ۔ یہ عارفانہ اور صوفیانہ متاع ہماری میراث ہے اور اگر ہم سنائی جیسے اپنے اسلاف سے بے توجہی برتیں گے تو ہمیں اچھے اخلاق میں شمار نہیں کیا جائے گا ۔

یہ حکیم سنائی رحمتہ اللہ علیہ کی کرامت ہے کہ مشرق و مغرب کے دانشور آج بھی انھیں خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں اور ان کی یاد سے ان کے قلب خوش و خرم ہو رہے ہیں ۔ شیخ سعدی شیرازی نے بجا فرمایا تھا ۔

دو دوست قدر شناسند عہد صحبت را
کہ مدتی ببریدند و باز پیوستند[۱۹]

۱۹- غزلہای سعدی بہ کوشش نوز اللہ ایرانپرست دانش سعدی تہران ص ۳۰۱ - صحیح شعر یوں ہے ۔
دو دوست قدر شناسند روز صحبت را کہ مدتی ببریدند و باز پیوستند

علامہ اقبال سے ایک ملاقات*

ریڈیو اسٹیشن پر سید نذیر نیازی مجھ سے ملے ۔ کہنے لگے ڈاکٹر صاحب دو دن سے آپ کو یاد کر رہے ہیں ۔ انھوں نے پیغام بھی بھیجا تھا ، آپ گھر پر نہیں تھے چند دنوں سے ان کی طبیعت زیادہ علیل ہے بھائی تاثیر مرحوم اتفاق سے وہاں موجود تھے ۔ علالت کا سنتے ہی ہم فی الفور کوٹھی پر پہنچے ۔

ڈاکٹر صاحب حسبِ معمول چار پائی پر لیٹے حقہ پی رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر وہ شگفتگی نہ تھی جو اکثر آشنا صورتوں کے دیکھنے سے پیدا ہو جایا کرتی ہے ۔ اس دن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ ہمیں دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے اچانک چونک پڑے ہوں ۔

مزاج پرسی کے بعد میں نے غرض کیا ۔ قبلہ آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا ، کیا ارشاد ہے ؟ کچھ دیر تامل کے بعد بولے یاد آیا ، وہ نوجوان کہاں ہے ؟ میں نے پوچھا کون نوجوان ؟ وہ جس نے مجھے نظمیں سنائی تھی ، وہ پھر آ سکتا ہے میں نے کہا کیوں نہیں ، جب بھی آپ فرمائیں حاضر ہو جائے گا ۔ فرمایا اسے ضرور بلائیے اور جلدی بلائیے مجھے اس کا گانا بہت پسند ہے ۔ تاثیر صاحب ، جو نوجوان کا اشارہ سمجھ گئے تھے ، بولے کم بخت کی آواز میں کتنا سوز ہے اور پھر وہ پڑھا لکھا آدمی بھی ہے ۔ فرمانے لگے پڑھے لکھے تو خیر

---

* یہ مقالہ دو مرتبہ 'ماہِ نو' میں شائع ہوا ۔ پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۵۳ء میں اور دوسری بار ، اقبال نمبر ، ستمبر ۱۹۷۷ء ، صفحات ۳۶۵ - ۳۶۶ ۔

اور بھی ہیں - وہ اس طرح شعر پڑھتا ہے جیسے خود بھی محسوس کر رہا ہو ، اس کی آواز دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے - پھر اسے فارسی ، اردو پنجابی بھی نظمیں یاد ہیں - اس روز عرشی[1] کی جو پنجابی نظم اس نے سنائی تھی بہت خوب تھی - میں عرشی کو محض مولوی سمجھتا رہا ، یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے سینے میں بھی ایک درد مند دل ہے ، اچھی نظم لکھی - اب وہ آہستہ آہستہ یہ مصرعے گنگنانے لگے -

اساں ہنجواں ہار پرونا ، دکھ تینوں نہیں او دسنا
تیرے سامنے بیٹھ کے رونا دکھ تینوں نہیں او دسنا

(ہم آنسوؤں کا تار پروئیں گے لیکن تمھیں اپنا دکھ نہیں بتائیں گے
ہم تیرے سامنے بیٹھ کر روئیں گے لیکن یہ نہیں بتائیں گے
کہ ہمیں کیا دکھ ہے)

اس پر پنجابی شاعری کی گفتگو کا سلسلہ چلا ، فرمانے لگے پنجابی ہماری مادری زبان ہے ، اس میں جو بات پیدا ہو سکتی ہے وہ کسی اجنبی زبان میں ممکن نہیں - اس زبان کو جب کبھی بڑا شاعر ملا تو اس نے شاہکار پیدا کیا - وارث کی ''ہیر'' ، فضل شاہ کی ''سوہنی مہینوال'' اور ہاشم شاہ کے دوہڑوں سے چل کر بات خواجہ غلام فرید چاچڑاں والے کی شاعری تک پہنچی -

ڈاکٹر صاحب بولے افسوس کہ خواجہ صاحب کی شاعری ایک علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی - ان کا کلام ایک گہرے مطالعہ کا مختلف ہے مجھے تو اس میں بین الاقوامی حیثیت و اہمیت کے عناصر نظر آتے ہیں - کچھ دیر رک کر فرمایا : ''ہاں تو مجھے یاد آیا کوڑا

۱- حکیم محمد حسین امرت سری جو علامہ اقبال کے نہایت مخلص نیازمندوں میں شمار ہوتے ہیں ، علامہ اقبال کی زندگی میں ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں - الحمد للہ ابھی تک بقید حیات ہیں -

کرکٹ کے ڈھیر کے لیے فارسی میں کون سا لفظ ہے ۔ سوچتا تھا تم آؤ تو پوچھوں'' میں نے عرض کیا قبلہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں ؟ کہنے لگے آپ فارسی پڑھاتے ہیں نا ۔ خیال تھا کوئی موزوں لفظ مل جائے گا میں نے دو تین لفظ پیش کیے فرمایا کہ یہ پہلے سے میرے ذہن میں ہیں میں زیادہ موزوں لفظ چاہتا ہوں ، ایک ایسے دماغ کے لیے تشبیہہ کی ضرورت ہے جس کا ظاہر خضرألدمن کی طرح عارضی طور پر شگفتہ نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر گندگی بھری ہوتی ہے ۔ ایک رباعی لکھنا چاہتا ہوں اسی لفظ کی تلاش ہے ۔ پیشتر اس کے کہ ہم پوچھتے وہ دماغ کون ہے وہ خود ہی بول اٹھے ہماری قوم کے اکثر اصحابِ فکر کے دماغوں کی یہی کیفیت ہے ۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر یوسف صاحب تشریف لے آئے اور ابھی وہ معائنے میں مصروف ہی تھے کہ شفاءالملک حکیم قرشی بھی آ پہنچے ۔ دونوں نے باہم مشورہ کیا ۔ ڈاکٹر صاحب سے استمزاج بھی کیا گیا ، کچھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوئیں ، چارہ گروں نے تسلیاں دیں اور کہا حالت پہلے سے بہتر ہے ، اور رخصت ہوئے ۔

ڈاکٹر صاحب یونانی علاج کا تذکرہ کرنے لگے اور کہا کہ جس قدر ان لوگوں کا طریقِ علاج افسردہ کر دیتا ہے اسی قدران کی بعض دوائیاں شگفتگی اور انبساط پیدا کرتی ہیں ، ، ہمیشہ سے ان کا قائل ہوں ۔ لیکن اب کے تو یقین ہو گیا ہے کہ ان دوائیوں میں ایسے عناصر موجود ہیں ، کہ انسان تندرست ہو نہ ہو ، ذہنی طور پر صحت یاب ضرور ہو جاتا ہے ، یہ کم بخت مرض کی تلخی کو بھی خوشگوار بنا دیتی ہیں ۔ شاید اتنے شدید مرض کے باوجود میرے زندہ رہنے کی یہی وجہ ہے ۔

اس پر وہ ایک لخت خاموش ہو گئے ، لمحے بھر کے بعد اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے یہ لوگ کہتے تو ہیں میں تندرست ہو رہا ہوں

لیکن یہ خواب اب ختم ہوتا نظر آتا ہے ۔

یہ بات کچھ ایسے غمناک لہجے میں کی گئی کہ ہم سب دم بخود ہو کر رہ گئے ۔ ان کا دیرینہ خادم علی بخش دروازے میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کسی نے کہا کیوں روتا ہے ۔ کوئی فکر کی بات نہیں ۔

ڈاکٹر صاحب لیٹ گئے ، آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا اسے مت روکو ۔ آخر ۵۳ سال کا ساتھ ہے ، جدا ہوتے تکلیف ہوتی ہے ۔

ہم واپس آ گئے اس کے بعد میری قسمت میں ان کی ملاقات کی بجائے ان کو کندھا دینا تھا گھر پہنچتے ہی میں نے اس نوجوان کو ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچا دیا ، لیکن بعض مجبوریوں کے باعث وہ حاضرِ خدمت نہ ہو سکا ۔

ان کے جنازے کے ساتھ ہزاروں کا مجمع تھا ۔ دوست عزیز ، عقیدت مند سبھی شامل تھے ۔ سب جنازے کو کندھا دینے کے لیے آگے بڑھتے ، لیکن ہجوم کے بہت پیچھے ایک شخص تنہا سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا ۔ آہوں کے ساتھ کبھی کبھی اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ بھی نکل جاتی تھی ۔

یہ وہی وعدہ شکن نوجوان تھا !

دگر دانائے راز آید کہ ناید*

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید ؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید ؟[1]

یہ قطعہ دانائے راز اقبال کی آخری پکار تھی - جسے لوگوں نے اس کی نئی سوچ اور اسلوب بیان کے اعتبار سے ترجمان حقیقت کہا اور جب اس نے اپنے کلام میں اسرار و حقائق کی پردہ کشائی کی تو اسے حکیم الامت کا لقب دیا -

اقبال نے مشرق و مغرب کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا - مشرق کے قدیم علمی و ادبی ذخائر سے خوشہ چینی کے بعد مغرب کے تازہ حکیمانہ افکار سے بہترین جواہر ریزے بھی چنے اور پھر ان دونوں کو نئی جلا دے کر انھیں ایک دوسرے سے نہایت فنکارانہ انداز میں پیوست کیا - ہر طرف سے اس حسین و جمیل مرقع کی داد کے نعرے بلند ہوئے اور بڑے بڑے اساتذہ بے ساختہ پکار اٹھے کہ ایسا حسین اور موثر امتزاج دنیائے ادب میں کم ہی دیکھنے میں آیا ہے -

---

* مطبوعہ برگِ گل (مجلہ گورنمنٹ اردو کالج کراچی) بیاد اقبال ۱۹۷۷ء صفحات ۹۱ - ۹۷ -

۱- کلیات اقبال ، حصہ ارمغان حجاز (فارسی) ، ص ۸۶۴ -

وہ افکار کیا ہیں ؟ اس مختصر سے مقالے میں تفصیل کی گنجائش نہیں ۔ میں صرف اقبال کے بعض ایسے شاعرانہ پہلوؤں کا تذکرہ کروں گا جن سے اُسے فارسی اور ادب و شعر میں ممتاز مقام حاصل ہوا ۔

۱۔ اقبال کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں فلسفہ و حکمت کے دقیق ، پیچیدہ اور خشک مسائل کو شعر کا جامہ پہنا کر اسے لطیف و پاکیزہ صورت میں پیش کیا اور اس میں فنی جذب و کشش بھر دی ۔

۲۔ اس نے مرزا غالب کے بعد شعر کے موضوعات کو وسعت دی اور انسانی زندگی کی کشادگی اور وسعت کو شعر کے سانچے میں یوں ڈھالا جیسے کوزے میں دریا بند کر دیا جائے ۔

۳۔ اس نے اپنی سوچ اور طرز نگارش میں وہ ہنر مندیاں دکھائیں کہ افکار اور فنکارانہ شاہکار سے ایک واضح اور مکمل نظامِ حیات سامنے آ گیا ۔ ایک نظام فکر ہی نہیں ایک پورا نظامِ حیات ۔

۴۔ اقبال نے اپنے خیالات سے قدیم اصطلاحات اور تلمیحات کا لہجہ بدل دیا ۔

لفظ ایک زبردست قہر مانی قوت ہوتی ہے اور شعر میں آ کر وہ قیامت ڈھاتا ہے ۔ اقبال نے اپنی قوت فکر سے الفاظ کو نیا معنوی لباس پہنایا ۔ تشبیہات و استعارات میں تازہ جان ڈال دی ۔ اس نے فارسی شعر کی صدیوں پرانی روایات کو تازگی دے کر اسے چار چاند لگا دیے اور اس میں وہ کمال فن دکھایا کہ حافظ ۔ عرفی ۔ نظیری ۔ طالب آملی اور غالب کی روحیں وجد کرنے لگیں ۔

اقبال کے یہ ترانے محض شعر و سخن کے فسانے نہیں ہیں ۔ بلکہ انسانی زندگی کو جھنجوڑنے کے دلکش اور پر زور ہنگامے بھی ہیں ۔ اقبال نے ان ہنگاموں کی قوت سے انسان کے اندر کی سوئی ہوئی زندگی کو بیدار کیا اور اسے اپنے آپ سے آشنا کیا وہ اپنے اس ہنگامے کا ذکر یوں کرتا ہے ۔

محفل رامش گری بر ہم زدم　　زخمہ برتار رگِ عالم زدم
نغمۂ من از جہانِ دیگر است　　ایں جرس را کاروانِ دیگر است
عاشقم فریاد ایمانِ من است　　شور حشر از پیش خیزان من است[۲]

اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے بڑی وضاحت اور بلند آہنگی کے ساتھ عظمت انسانی کا نعرۂ بلند کیا ۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ اس امر کی طرف اشارے موجود ہیں کہ انسان اس کائنات کی عظیم مخلوق ہے ۔ اسے احسن التقویم کے لقب سے نوازا اور مسجود ملائک قرار دے کر اس امر کی تصدیق کی[۳] ۔

انسان میں تمام صفات الٰہیہ جبلی طور پر موجود ہیں ۔ اس کی زندگی کا مقصد انہی صفات کو ابھارنا ہے اور ابھار کر اس مقام ارفع کے حصول تک کے لیے تگ و دو کرنے پر آمادہ کرنا ہے جس کے لیے اسے خلق کیا گیا ۔ اسی میں اس کی انا کی تشکیل اور اس کی خود آگاہی اور خودی کا ارتقا پوشیدہ ہے ۔

انسان کے لیے لازمی ہے کہ اس کی نظروں کے سامنے ایک بلند نصب العین ہو اور اس کی خواہشات عام حیوانی سطح سے بالا تر ہوں ۔ اس کی زندگی اخلاقی اور روحانی اقدار کی حامل ہو ۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے اس کے دل میں پیہم تلاش و جستجو کا جذبہ موجزن ہو ۔ اور اس جذبے میں تڑپ ہو جو اسے ہر لحظہ

۲- کلیات اقبال ، حصہ اسرار و رموز (فارسی) ، ص ۶ ، ۷ ۔
۳- دیکھیے قرآن پاک پارہ ۳۰ ، سورہ والتین (مکی) ۔

مضطرب اور بے قرار رکھے - یعنی عشق -

اقبال نے انسانی زندگی کے ان تمام حقائق کو اپنی شاعری میں سمو لیا اور اپنے شاعرانہ کمال فن سے اسے یوں بیان کیا کہ یہ تمام دقیق حقائق انسانی ذہن کے قریب تر آ گئے -

اقبال نے اپنے مقالات میں حکیمانہ افکار کو کھول کر بیان کیا ہے - لیکن اس کے باوجودان خیالات کی گہرائیاں آسانی سے انسانی ذہن میں نہیں سماتیں - لیکن جب اقبال انھیں شعر کا جامہ پہناتا ہے تو وہ حقائق سننے والوں کے قلب میں اتر جاتے ہیں -

اقبال جگہ جگہ اپنی شاعری کے اظہار فن سے گریز کرتا دکھائی دیتا ہے اور اعلانیہ کہتا ہے کہ میرا شعر ، شعر نہیں کوئی اور شے ہے اسے اثر بہار نہ کہو - پھر یہ بھی کہتا ہے -

نہ زباں کوئی غزل کی ، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی[۴]

لیکن حقیقت میں یہی دلکشا صدا ہی اس کی شاعری کی جان ہے - اس دلکشا صدا کو پیدا کرنے کے لیے اس نے نہ صرف اپنے قلم کو خون جگر میں ڈبویا ہے - بلکہ لفظ و صوت کی گلکاریاں بھی دکھائی ہیں -

وہ ایک Conscious Artist تھا اور طبعاً فن کی گہرائیوں سے آشنا تھا -

زیادہ مثالیں پیش کرنے کا یہ وقت نہیں لیکن یہ ایک چھوٹی سی نظم دیکھیے :

۴- کلیات اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۱۷ -

(دریائے نیکر کے کنارے)[۵]

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر[۵] کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا[۶]

فارسی کی یہ غزل سنیے :

صورت نہ پرستم من ، بت خانہ شکستم من
آں سیل سبک سیرم ، ہر بند گسستم من

در بود و نبودِ من اندیشہ گمانہا داشت
از عشق ہویداشد ایں نکتہ کہ ہستم من

در دیر نیاز من ، در کعبہ نمازِ من
زنار بدوشم من ، تسبیح بدستم من

سرمایۂ دردِ تو غارت نتواں کردن
اشکے کہ ز دل خیزد ، در دیدہ شکستم من

فرزانہ بگفتارم ، دیوانہ بہ کردارم
از بادۂ شوقِ تو ہشیارم و مستم من[۷]

۵- نظم کا عنوان ہے 'ایک شام' اور ذیلی عنوان ہے 'دریائے نیکر' (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر -
۶- کلیات اقبال ، حصہ بانگ درا ، ص ۱۲۸ -
۷- کلیات اقبال ، حصہ پیام مشرق ، ص ۳۲۲ -

اقبال کے فکر و فن کی معراج دیکھنا ہو تو اس کی دو نظموں ''ساقی نامہ'' اور ''مسجد قرطبہ'' پر نظر ڈالیے - یہ دونوں نظمیں اقبال کے فلسفۂ حیات کی بہترین آئینہ دار ہیں -

دونوں نظموں کا موضوع دراصل ایک ہے لیکن دونوں کے عنوان الگ الگ ہیں ، مزاج الگ الگ ہے - لہجہ الگ الگ ہے -

''ساقی نامہ'' ایک خاص صنف شعر ہے ، رواں دواں ، شگفتہ و شاداب ، شاعر نے اس کے لیے مثنوی کی چھوٹی بحر اختیار کی ہے -

زبان ہلکی پھلکی ہے اور اس میں فارسی اور عربی سے زیادہ ہندی الفاظ کی آمیزش ہے - مسجد قرطبہ کا موضوع مقدس ہے - اس اعتبار سے شاعر نے اس کے لیے طویل بحر اختیار کر کے اس کی ثقاہت کو بر قرار رکھا ہے - لمبی بحر میں لمبی ردیف بالعموم موسیقیت پیدا کرتی ہے ، لیکن اقبال نے اس میں خصوصیت کے ساتھ ساتھ قافیہ اور ردیف کے التزام کو چھوڑ کر صرف روی اختیار کی ہے - اور کمال یہ ہے کہ نظم کے تمام بند غنائی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں - شاعر نے بڑی فنکارانہ مہارت سے اندرونی ترنم سے ردیف کی کمی کو پورا کیا ہے - ساتھ ہی اس خیال سے کہ یکسانیت کے تسلسل سے کہیں نظم کی کیفیت میں فرق نہ آ جائے ہر بند کے ٹیپ کے شعر میں قافیہ ردیف لایا ہے -

اقبال کی یہ فنکارانہ ہنرمندی اس کی شاعری کی ایک خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے کلام میں ہئیت اور موضوع میں ہم آہنگی کو ملحوظ رکھا ہے یعنی موضوع کی نوعیت کے مطابق ، صنف سخن انتخاب کی ہے - غور کریں تو بال جبریل ، کی بہت سی غزلیں ایسی ہی ہیں اور مزہ یہ ہے کہ وہ اقبال کی بہترین غزلیں بھی ہیں - اس غزل کو سنیے -

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں !

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں !

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰی سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں !

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں !۸

شاعر کا حال یہ ہے کہ اس نے غزل میں نظم کا فکری تسلسل پیدا کیا ہے اور ساتھ ہی غزل میں غنائی کیفیت کو بڑی خوبی سے سمویا ہے ۔ اقبال کے ''بال جبریل'' اور دوسرے اردو مجموعے میں غزلوں کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہے ۔

حالی اور آزاد نے جب غزل کے خلاف آواز اٹھائی تو یہ پرانی صنف شعر کچھ وقت کے لیے دب کر رہ گئی ۔ ایک وقت ایسا خدشہ بھی پیدا ہوا کہ صدیوں پرانی پیاری اور مقبول صنف کہیں فنا نہ ہو جائے ۔ لیکن پھر رد عمل ہوا اور جگر ، یاس اور فانی اور اصغر اور حفیظ نے غزل کو پھر بھارا اور اسے وسعت دے کر ایک مقام عطا کیا ۔ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس صنف کو مستقل تازہ اور پائیدار قوت بخشی اور اسے فارسی اور اردو کی دوسرے صنفی شاہکاروں کا ہم پایہ بنا دیا یہ اس کا ایک اور شاعرانہ امتیاز ہے ۔

۸۔ کلیات اقبال ، حصہ بال جبریل ، ص ۲۷ ، ۲۸ ۔

اقبال کے کلام کی فنی دلآویزیوں کا مکمل جائزہ لینا دشوار ہے - اس لیے میں اس سے گریز کر کے اس کی شاعری کے ان اثرات کی طرف چند اشارے کروں گا جو ہماری دنیائے ادب و شعر میں رونما ہوئے - اگرچہ ان اثرات کا دائرہ محض ادب و سخن تک محدود نہیں رہا -

اقبال کی ابتدائی شاعری کچھ وقت کے لیے عام روش پر چلتی رہی - جونہی انھوں نے قدم آگے بڑھایا تو آن کے تتبع میں بیسیوں شاعروں نے نظمیں لکھنے کی کوشش کی -

طویل نظموں کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ نظمیں کتابچوں میں چھپنے لگیں - مگر

قبول خاطر و لطف و سخن خدا داد است[۹]

اقبال سب پر غالب آیا -

اقبال کے کلام کے اثرات ادب و شعر سے پھیل کر سیاست اور صحافت تک پہنچے - مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہر کی مثالیں سامنے ہیں - پنجاب میں شاعری کے عام موضوعات نے جادہ بدلنا شروع کیا -

جنگ عظیم کے بعد برصغیر پاک و ہند میں آزادی کی تحریک ہوئی - ایک وقت ایسا آیا کہ اقبال خاموش ہو گئے - ادبی فضا میں سناٹا چھا گیا - یار لوگوں نے ایک خلا سا محسوس کیا - ہر طرف سے اقبال کو سخن گوئی پر اکسایا گیا ، لیکن وہ چپ رہے -

آخر حکیم محمد حسین عرشی نے ایک چھوٹی سی نظم کچھ اس

۹- دیوان حافظ شائع کردہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور (س - ن) ص ۵۱ - مکمل شعر یوں ہے -

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ
قبول خاطر و لطف و سخن خدا داد است

پیرائے میں لکھی کہ اقبال بول اٹھے ۔

دانی کہ چیست شیوۂ مردانِ پختہ کار
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست[۱۰]

اقبال کے کلام کی اثر انگیزی پھیلتی گئی ۔ شاعروں میں بالخصوص پنجاب کے شعرا میں اقبال کا انداز نگارش پیدا ہونے لگا ادبی محفلوں کا رنگ بدلا ۔ اردو شاعری نئی کروٹیں لینے لگی ۔ نوجوان شعرا کی سوچ نے نئی نئی راہیں ڈھونڈنی شروع کیں ۔ اس کا اثر شمالی ہند سے گزر کر دکن تک پہنچا ۔

اقبال کے مخالفوں نے بھی اس کا لوہا مانا ۔ جوش ملیح آبادی جیسے رومانوی شاعر کو قومی نظمیں لکھنے کا خیال آیا ۔ اور یہ خیال ایک مستقل حیثیت اختیار کر گیا ۔

پاکستان میں بالخصوص اقبال کے زیر اثر بیک وقت فارسی اور اردو میں لکھنے والے ابھرے اور اس کا اثر پنجابی ، پشتو ، سندھی اور بلوچی شعرا پر بھی ظاہر ہوا ۔ اقبال کی شاعری رفتہ رفتہ تعلیمی اداروں تک پہنچی اور طلبہ میں ایک تازہ ادبی احساس نے جنم لیا ۔

اقبال کی فارسی شاعری جو ضخامت میں اردو سے کہیں زیادہ ہے اور دقیق اور اہم بھی ہے ۔ افغانستان اور ایران کے رہنے والوں پر اثر انداز ہوئی ۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لسانی عصبیت پسندوں نے بھی زبان دانی کے حدود کو نظر انداز کر کے ان کے افکار کی داد دی ۔ بلکہ ایران کے ملک الشعراء نے تو اپنے ہم وطنوں سے یہاں تک کہہ دیا کہ تم سمجھتے ہو کہ اقبال تمہاری زبان یعنی فارسی میں شعر کہتا ہے ۔ نہیں ، وہ اپنی زبان میں شعر

۱۰- باقیاتِ اقبال ، ص ۲۴۸ ۔

کہتا ہے ۔ اور یہ بڑی حقیقت بیانی تھی ۔

ہر بڑا شاعر اپنی زبان میں شعر کہتا ہے ۔ کیونکہ وہ زبان کو جو نئے معانی و مطالب عطا کرتا ہے وہ لغت میں نہیں ملتے ۔ یہاں ایک بات ذہن میں آئی ۔

اقبال نے جب ہمالہ کے حصار کو پھاند کر ادھر اُدھر نظر ڈالی تو یہاں کے لوگوں نے اسے حب وطن سے عاری ہونے کا طعنہ دیا ۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا تو Pan Islamism کا مبلغ قرار دیا گیا ۔ ذرا اور پاؤں پھیلے تو بعض نے اسے اشترا کی گردانا ۔ لیکن یہ غلط تاثر سب سے زیادہ اقبال کے مغربی قارئین میں پیدا ہوا کہ اقبال اپنی قدیم اسلامی تاریخ اور اس کی شاندار روایات اور شخصیات میں الجھا رہا ۔ اس پر اسے قدامت پسند ہونے کا مرتکب ٹھہرایا گیا ۔

مگر یہ بات کہ اقبال اسلامی شخصیات اور اسلامی تعلیمات کا گرویدہ تھا کسی حالت میں بھی اس کی عظمت میں خلل انداز نہیں ہوئی ۔ دنیا کا ہر بڑا شاعر اس جرم کا مرتکب ہوا ہے ۔ اگر یہ عنصر غائب ہو جائے تو دانتے ، گوئٹے ، رومی اور سعدی کو بھی نظر انداز کرنا پڑے گا ۔

سیاست میں اقبال کا اثر قائد اعظم کے خیالات پر بھی ہوا ۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ، ''اتحاد ، تنظیم اور یقین'' قائد اعظم کا موٹو تھا ۔ یہ الفاظ ہیں جو اقبال طرح طرح اور جگہ جگہ استعمال کرتا ہے ۔ کیونکہ یہ اس کے فلسفۂ حیات کی اساس ہیں ۔ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور قائد نے اس کی تعبیر کی ۔

یہاں یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے ۔ عام طور پر قاعدہ ہے کہ ہر فرد جس گھرانے میں پیدا ہوتا ہے اس گھرانے کی روایات اور عقائد کا طبعاً اس میں پیدا ہو جانا ناگزیر ہوتا ہے لیکن اقبال

جب اسلامی نظام حیات کو انسانی زندگی کے لیے بہترین نظامِ حیات کہتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ ایک مسلمان تھا یا مسلمان والدین سے یہ عقیدہ ورثے میں لے کے آیا تھا بلکہ اس لیے کہ اس نے تاریخ عالم میں مختلف ایسے نظام ہائے حیات کا مطالعہ کیا تھا ۔ وہ ان کے نتائج و عواقب سے آگاہ تھا اسلامی نظامِ حیات کا انتخاب اس کے مطالعے اور تجربے کا نتیجہ تھا ۔ وہ فی الواقعہ اسے بہترین سمجھتا تھا ۔

قائد اعظم محمد علی جناح برسوں پاک و ہند کی تحریک آزادی میں شریک رہے اور ہر رنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے مسلمان لیڈروں نے بھی بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں ۔ لیکن سالہا سال کے تجربے نے یہ بات واضح کر دی کہ اس دیس میں ہندو قوم مسلمانوں کے ساتھ کوئی منصفانہ سمجھوتا کرنے پر رضا مند نہیں ، بلکہ ان کے جائز حقوق کو تسلیم نہیں کرتی ۔ ان کا وجود بھی ان کی نظر میں کھٹکتا ہے ۔ تو ناچار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایسی الگ مملکت کی ضرورت ہے جہاں مسلمان آزادی کے ساتھ سانس لے سکیں اپنے دینی فرائض اور اخلاقی روایات کو نبھا سکیں ۔ چنانچہ پاکستان کا تصور اور اس کا عملی وجود قائد ملت کے محض مسلمان ہونے کی دلیل نہیں تھا بلکہ ان کے مدت العمر کے تجربات کا نتیجہ تھا ۔ اور یہ چیز اقبال اور قائد اعظم میں مشترک تھی ۔

منظوم خراج عقیدت

(ا) فارسی

(ب) اردو

(ج) پنجابی

اقبال

(۱)

به بزمِ بیدلان شمعِ حیات افروختی رفتی
وفا نا آشنایان را وفا آموختی رفتی

نه این دنیا پسند آمد ، نه آن دنیا پسند آمد
نه آن اندوختی رفتی ، نه این اندوختی رفتی

نبوده سوِ غیران در خورِ طبعِ بلندِ تو
تو قلبِ خویش را با آتشِ خود سوختی رفتی

بیک حرفِ اثر آسوده کردی صد پریشان را
بیک تارِ نظر ، صد چاکِ داماں دوختی رفتی

به چشمِ کم نگاهاں ریختی نورِ بصیرت را
به قلبِ سرد روحاں سوزِ جاں افروختی رفتی

———

اقبال*

(ب)

سونی سونی تھی پڑی ارضِ کہن برسوں سے
مضمحل سے تھے در و دشت و دمن برسوں سے

ایک سناٹے میں ڈوبی تھی فضائے گردوں
اک روش پر تھا زمانے کا چلن برسوں سے

نہ کہیں گل ہی مہکتا ، نہ چٹکتی تھی کلی
ایسے ویران تھے ایوان چمن برسوں سے

دم بخود سی نظر آتی تھیں حسیں آوازیں
سخت افسردہ تھی دنیائے سخن برسوں سے

بزم بے سوز تھی ، خاموش تھے نغماتِ ہنر
بجھ چکا تھا شررِ شوخیٔ فن برسوں سے

''نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد''

اس کے آتے ہی امنگوں کی فضا جاگ اٹھی
آرزوؤں کے مچلنے کی ادا جاگ اٹھی

---

* مطبوعہ صحیفہ ، اقبال نمبر حصہ اول جولائی اکتوبر ۱۹۷۷ء ، صفحات ۱۵۶ - ۱۵۹ -

اس کی آواز سے پھر زیست کا نغمہ ابھرا
ہر رگِ ساز میں اک تازہ نوا جاگ اٹھی
وہ چلا رہ کہ کھلیں راہروؤں کی آنکھیں
کارواں چونک پڑا ، بانگِ درا جاگ اٹھی
ذہنِ انساں میں چمکنے لگا پیمانِ ازل
شوق بیدار ہوا ، خوئے وفا جاگ اٹھی
پھر دمکنے لگا خورشید کا روئے تاباں
پھر سے سوئی ہوئی کرنوں کی ضیا جاگ اٹھی

آتشے در دلِ افسردۂ ما ریخت و رفت
جانِ تازہ بہ تنِ مردۂ ما ریخت و رفت

اقبال

(ج)

جانے کیڑیاں کھونجاں وچوں چمکاں لے کے آیا سیں
راہواں دے ذریاں نوں چک کے تاریاں سنگ ملایا توں
جانے کتھوں آس امید دے حوصلے چک لیایا سیں
صدیاں رلے بے وسیاں نوں سدھراں وچ وسایا توں

صبح نوں اٹھ کے سجدیاں دے وچ جھک جھک دعاواں کردا رہیا
شام شفق دی سرخی اتے خون جگر دا ملیا توں
دن نو مٹھیاں گلاں کر کے دل دے زخم نوں سلیا توں
رات دے گھپ ہنیرے دے وچ لک لک آہواں بھردا رہیا

ترا پیام عمل دا سی اسیں بے عملی وچ آکھبے
ہور ای طور طریقے پھڑ لے ، ہور ای پاسے ڈھل گئے
خودی دے درس نوں چھڈ دتا تے خود غرضی وچ جا ڈبے
اپنیاں گلاں کردے کردے تیریاں گلاں بھل گئے
فیر وی ساڈے دلاں دے اندر جاگ رہی اے یاد تری
فیر وی ساڈے کناں وچ گونج دی اے فریاد تری

اشاریه

★ اشخاص

★ اماکن

★ کتب و رسائل

اشخاص

الف

آزاد : ۷۸ -
آل احمد سرور : ۷۸ -
آئن سٹائن : ۱۳۲ -
اصغر : ۳ -
افضل حق قرشی : ۷ -
ابو عبیدہ : ۴۶ ، ۱۲۷ -
ابراہیم (خلیل اللہ) : ۱۶۷ -
اجمل (محمد اجمل خان حکیم) : ۷ -
اکبر الہ آبادی : ۷۹ ، ۸۰ ، ۱۴۹ -
احمد الدین (خواجہ ، امرت سری): ۱۰ ، ۱۲ -
امام حسینؓ : ۹۰ -
الطاف حسین (سید) : ۱۶ ، ۱۸ -
اسمٰعیل میرٹھی : ۲۶ -
احمد بریلوی (سید) : ۱۴۷ -
انوری : ۱۷۳ -
اویسؓ (قرنی) : ۱۸۳ -

ب

بدر الدین بدر : ۱۷ -
بلالؓ : ۴۶ ، ۱۲۸ -
برگساں : ۱۳۲ -
بوذرؓ : ۴۶ ، ۱۲۸ ، ۱۸۳ -
بو علی : ۱۶۰ ، ۱۷۹ -
بہاء الدین اورنگ : ۱۷۳ -

پ

پطرس بخاری : ۲ ، ۱۵ -

ت

تاثیر (ڈاکٹر محمد دین) : ۲ ، ۷ ، ۹ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۸۱ ، ۱۸۵ -
تبسم (غلام مصطفٰی) : ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۹ ، ۱۱ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ (بتکرار) ، ۱۹ (بتکرار) ، ۲۰ ، ۱۳۱ -

ج

جاپان : ۱۲۷ ، ۱۲۸ -

جامی (مولانا) : ۱۷۲ -
جاوید اقبال : ۱۷ -

ح

حافظ : ۲۷ ، ۱۹۰ ، ۱۹۶ -
حالی : ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۳ ، ۹۲ ، ۱۴۸ -
حفیظ اللہ (قاضی) : ۷ -
حفیظ ہوشیارپوری : ۱۶ ، ۱۸ -
حسرت موہانی : ۷۵ -
حیدرؒ : ۴۶ ، ۱۲۸ -

خ

خضر تمیمی : ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ -
خلیل (ابراہیم ، خلیل اللہ) : ۶۵ -

د

داغ دہلوی : ۴۷ ، ۶۴ -
داؤد : ۳۵ -
دانتے : ۱۹۸ -

ذ

ذوق : ۶۴ -

ر

رازی (ایف۔ ڈی رازی ، پروفیسر): ۱۴ -
رشید احمد (ڈاکٹر) : ۲ -
رازی (امام) : ۱۶۰ -
روم (مولانا) : ۱۷۱ ، ۱۷۳ ، ۱۷۸ ، ۱۹۸ -

ز

زار : ۱۴۰ -
زہرہؒ : ۱۸۱ ، ۱۸۳ -

س

سر سید احمد خان : ۱۴۹ -
سراج نظامی : ۱۶ -
سکندر : ۱۴۰ -
سنائی (حکیم) : ۱۷۳ ، ۱۷۵ ، ۱۷۷ ، ۱۸۴ -
سودا : ۹۱ -
سعدی شیرازی : ۱۸۴ ، ۱۹۸ -

ش

شبلی : ۷۹ ، ۸۰ -
شہباز کاشمیری : ۳
شہاب الدین (شیخ) : ۱۵۵ -

ط

طالب آملی : ۱۲۳ ، ۱۹۰ -

ظ

ظفر علی خاں (مولانا) : ۱۹۶ -

ع

عابد (عابد علی عابد) : ۲ -
عائشہ تسلیم : ۲۱ -
عارف : ۹۱ -
عرشی (حکیم محمد حسین امرتسری) : ۵ ، ۱۳ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۱۸۶ ، ۱۹۶ ، ۱۹۷ -

عبدالحکیم (خلیفہ) : ۱۷۰ -
عرفانی کاشمیری : ۳ -
عبدالواحد (سید معینی) : ۲۸ -
عطار : ۱۷۳ -
عنایت اللہ (شیخ ڈاکٹر) : ۱۲ ، ۱۳ -
عشرت حسین (سید) : ۱۵۰ -
عرفی : ۱۹۰ -
عبدالرشید طارق : ۱۶ ، ۱۷ -
علی بخش : ۱۷ ، ۱۸۸ -
علی حزیں (شیخ) : ۱۷۷ -
عیسیٰ (روح اللہ) : ۳۵ -

غ

غالب (اسد اللہ خان) : ۱۴ ، ۲۴ ، ۲۹ ، ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۵ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۱۴۷ ، ۱۸۱ ، ۱۹۰ -
غلام رسول (صوفی) : ۱ -
غزنوی حکیم : ۱۷۸ -
غلام رسول (حکیم ، مفتی) : ۱ -
غلام رسول (مہر) : ۱۴۸ -
غلام فرید (خواجہ، چاچڑاں والے): ۱۸۶ -

ف

فردوسی : ۹۱ ، ۱۷۳ -
فضل شاہ : ۱۸۶ -
فیروز الدین (طغرائی) : ۱ ، ۸ -
فقیر محمد چشتی (شفاء الملک حکیم) : ۸ -

ق

قائد اعظم (محمد علی جناح) : ۱۹۸ ، ۱۹۹ -
قنبر رض : ۴۶ ، ۱۲۸ -
قیصر : ۱۴۰ -
قرشی (حکیم، شفاءالملک): ۱۸۷ -

ک

کرم (بابو کرم امرت سری) : ۱۶ -
کلیم اللہ (موسیٰ) : ۳۲ ، ۶۵ -

گ

گرامی (جالندھری) : ۵۳ -
گوئٹے : ۱۹۸ -

م

مجتبیٰ مینوی (آقائی) : ۵ ، ۲۰ -
محتشم کاشی : ۶۰ -
محی الدین ابن عربی : ۱۵۵ -
محمود شیرانی (حافظ) : ۹ -
محمود غزنوی : ۱۶۰ -
محمد ریاض (ڈاکٹر) : ۱۷۳ -
مولوی (دیکھیے احمد الدین خواجہ مولوی) :
مومن : ۱۴۷ -
موسیٰ (کلیم اللہ) : ۳۲ -
محمد علی جوہر : ۱۹۶ -
میر : ۹۱ -
محمد حسین امرت سری دیکھیے عرشی -

محمدؐ (مصطفٰی) : ۱۷۷ ، ۱۹۵ -

ن

ناصر قریشی : ۸ -
ناسخ (شیخ) : ۲۳ ، ۶۴ -
ناصر کاظمی : ۵ -
نذیر نیازی (سید) : ۱۸۵ -
نسیم محمود (میر) : ۵ -
نصیر الدین ہاشمی : ۱۸ -
نظیری : ۴۰ ، ۱۹۰ -

و

وارث (شاہ) : ۱۸۶ -

ہ

ہاشم شاہ : ۱۸۶ -

ی

یعقوب توفیق : ۱۳۱ ، ۱۴۷ -
یوسف (ڈاکٹر) : ۱۸۷ -

——:o:——

اماکن

الف

اسلام آباد : ۱۹ -
افغانستان : ۱۷۳ -
امرت سر : ۳ ، ۸ ، ۹ ، ۱۱ -
ایران (ایرانی) : ۲ ، ۳۶ ، ۱۲۷ -
ایشیا : ۲۶ ، ۳۶ ، ۴۱ ، ۵۵ -
افریقی (افریقہ) : ۳۱ -
اندلس : ۵۶ ، ۶۴ ، ۶۵ -
امریکہ : ۱۳۲ -

ب

بطحا : ۱۸۱ ، ۱۸۲ -

پ

پاکستان : ۱۸۰ -

ت

تہران : ۱۸۴ -

ج

جاپانی (جاپان) : ۴۶ -

چ

چین : ۴۵ -

ح

حجاز : ۴۵ -

د

دہلی : ۱۴۸ ، ۱۴۹ ، ۱۵۰ -

ر

روم : ۴۳ -

ع

علی گڑھ : ۹۱ ، ۱۸۱ -

غ

غزنی : ۱۷۷ -

ق

قرطبہ : ۵ ، ۶۱ -

ک

کراچی : ۱۹ -
کلکتہ : ۹۱ ، ۱۳۱ ، ۱۴۷ ، ۱۸۹ -
کابل : ۱۷۷ -

ل

لاہور : ۱ ، ۲ ، ۳ (بتکرار) ۵ ،
۶ ، ۷ ، ۸ ، ۹ ، ۱۱ ، ۱۲ ،
۱۳ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۲۰ ، ۲۱ ،
۲۸ ، ۵۲ ، ۵۷ ، ۷۷ ، ۹۹ ،
۱۵۵ ، ۱۶۳ ، ۱۶۹ ، ۱۷۳ ،
۱۷۷ ، ۱۹۶ -

لکھنؤ : ۳۲ ، ۴۰ -

م

مکی (مکہ) : ۱۸۱ ، ۱۸۲ -

ہ

ہسپانیہ : ۵۷ -
ہندوستان : ۲۶ ، ۳۱ ، ۵۵ -

——:o:——

کتب و رسائل

الف

القرآن : ۱۳۳ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ ، ۱۶۸ ، ۱۷۰ ، ۱۷۸ ، ۱۸۰ ، ۱۹۱ -

اطفال (مجلہ) : ۳ -

اقبال کا فکر و فن : ۷ ، ۱۵ -

اقبال ریویو (مجلہ) : ۱۵ ، ۱۰۹ -

انتخاب کلام اقبال : ۳ ، ۲۰ -

اورینٹل کالج میگزین مجلہ : ۱۸ -

انتخاب کلام امیر خسرو : ۳ -

اقبال اور بچے : ۳ ، ۲۱ -

انجمن : ۳ -

اسرار خودی : ۱۵ ، ۴۲ ، ۱۲۶ ، ۱۳۳ ، ۱۶۳ -

امروز : ۲۱ ، ۵۷ ، ۷۷ -

اسرار و رموز : ۲۸ ، ۲۹ ، ۵۶ ، ۱۰۰ ، ۱۲۶ -

ب

بال جبریل : ۱۵ ، ۵۷ ، ۷۷ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۱۰۹ ، ۱۸۰ ، ۱۹۴ ، ۱۹۵ -

بلاغ (مجلہ) : ۱۰ -

برگ گل (مجلہ) : ۱۸۹ -

باقیات اقبال : ۲۸ -

بانگ درا : ۳۶ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ۴۹ ، ۵۸ ، ۱۳۳ ، ۱۴۸ -

پ

پاک جمہوریت (مجلہ) : ۱۶۳ -

پھول (مجلہ) : ۳ -

پنجاب کی شاعری پر فارسی روایات کا اثر : ۴ -

پنجابی ادب (مجلہ) : ۳ -

پیام مشرق : ۳۸ ، ۶۸ ، ۱۳۱ ، ۱۳۳ -

ت

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ : ۷۷ -

تقاریر یوم اقبال : ۷۷ -

تیر و نشتر : ۲۰۴ -

ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں : ۴ -

ج

جاہ و جلال : ۴ -
جھولنے : ۴ -
جاوید نامہ : ۱۳ ، ۱۴ ، ۲۱ ، ۴۰ ، ۵۶ ، ۱۰۰ -

ح

حرف و صوت : ۴ ، ۲۰ -
حکمت قرآن : ۴ -

د

دو گونہ : ۴ -
دیوان گرامی : ۵۳ -
دیوان غالب (اردو) : ۹۱ ، ۱۱۰ ، ۱۸۱ -
دیوان حکیم السنائی الغزنوی : ۱۷۴ ، ۱۸۱ ، ۱۸۳ -

ر

راوی (مجلہ) : ۱۰ ، ۱۳ ، ۲۳ -
روح غالب : ۵ -
رموز بے خودی : ۱۲۳ ، ۱۳۴ ، ۱۶۳ -

ز

زندہ نغمے : ۵ -

س

سرا پردۂ افلاک : ۵ ، ۲۱ -
سکھی گھر (مجلہ) : ۳ -
سوہنی مہینوال : ۱۸۶ -

ش

شاہنامہ فردوسی : ۹۱ -
شرح صد شعر اقبال : ۵ ، ۲۰ -
شرح غزلیات غالب : ۵ -
شعر فارسی معاصر : ۵ -

ص

صحیفہ (مجلہ) : ۲۰۱ -

ع

علامہ اقبال : ۵ ، ۲۰ -
علامہ اقبال کی شاعری (مقالہ) : ۱۸ -
غزلہای سعدی : ۱۸۴ -

ف

فکر اقبال : ۱۷۰ -

ک

کلیات طغرائی : ۵ -
کلیات طالب آملی : ۱۲۳ -
کلیات شیخ علی حزیں : ۱۷۷ -
کلیات اقبال : ۱۴ ، ۱۶ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۷ ، ۵۰ - ۵۶ ، ۸۵ ، ۸۷ ، ۹۴ ، ۹۶ ، ۹۷ ، ۹۸ ، ۱۰۱ - ۱۰۷ ، ۱۱۲ - ۱۲۱ ، ۱۲۸ - ۱۳۰ ، ۱۳۳ ، ۱۳۶ - ۱۴۴ ، ۱۵۳ ، ۱۵۸ - ۱۶۱ ، ۱۶۴ ، ۱۷۳ ، ۱۷۴ ، ۱۷۷ ، ۱۸۳ ، ۱۸۹ - ۱۹۶ -
کلیات اسمعیل میرٹھی : ۲۶ -

کلیات نظیری : ۴۰ -
کلیات اکبر الہ آبادی : ۱۵۰ -

گ

گلستان سعدی : ۲۷ -

ل

لیل و نہار (مجلہ) : ۲ ، ۳ ، ۹۹ -

م

ماہ نو (مجلہ) : ۱۶ ، ۱۸۵ -
مخزن (مجلہ) : ۳ -
مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوقِ سیاحت : ۶ -
ملفوظات : ۱۷ ، ۱۸ -
مقالات یوم اقبال : ۱۴۷ -
منشوراتِ اقبال : ۱۵۵ -
مطالبِ بانگِ درا : ۱۴۸ -
مکتوبات سر سید احمد خاں : ۱۴۹ -
مسدس حالی : ۱۴۹ -

ن

نقش اقبال : ۶ ، ۲۱ -
نقوشِ اقبال : ۱۴ -
نقوش (مجلہ) : ۲۳ ، ۱۳۱ -
نیرنگ خیال (مجلہ) : ۲۳ -

ہ

ہیر وارث شاہ : ۱۸۶ -

ی

یاد اقبال : ۱۷۳ -
یک ہزار و یک سخن : ۴ -
یورپ میں دکنی مخطوطات : ۱۸ -

——:o:——